اصحاب علم و ذوق اور روحانی اشخاص کا ذکر بھی کرتے ہیں، اور یہ ذکر مختصر ہونے کے باوجود بہت متوازن اور ایسا جامع ہوتا ہے کہ اشخاص کا سراپا سامنے آجاتا ہے، ہر ہر شہر کے کتب خانوں کی سیر کا ذکر بھی کیا ہے، جنوبی ہند خصوصاً مدراس کے سفر میں وہاں کے مسلمانوں کی سیاسی، سماجی، تجارتی اور تمدنی حیثیتوں پر بھی اظہار خیال کیا ہے، اور شمالی ہند سے تقابل کرکے دکھایا ہے کہ وہاں کے مسلمان دوسری قوموں کے مساوی ہیں، نہ ان کے ساتھ کسی قسم کا امتیاز برتا جاتا ہے اور نہ ادہ دوزبان بے تعصبی کا شکار ہے، حیدرآباد کے سفر نامہ میں اس کے اہم علمی، ادبی اور اشاعتی اداروں کے علاوہ اس کی "تسخیر" کا بھی دردانگیز نقشہ کھینچا ہے، دونوں سفر نامے مولانا کے ادب و انشاء کی رعنائیوں اور لطافتوں سے معمور ہیں۔

**ملت اسلامیہ کا سفر**:۔ مرتبہ ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۶۶، قیمت:۔ تین روپے۔ پتہ:۔ اسٹوڈینٹس اسلامک مومنٹ آف انڈیا۔ ناگپور۔

یہ کتابچہ ملت اسلامیہ کی مختصر سرگذشت ہے، اس میں مسلمانوں کے گذشتہ واقعات، عہد رسالت، خلافت راشدہ، خلافت بنی امیہ، خلافت عباسیہ اور دولت عثمانیہ وغیرہ کے زیر عنوان سنہ وار بیان کیے گئے ہیں، عباسیوں کے ضمن میں ان کے زمانہ کی خود مختار سلطنتوں، پھر اندلس کے امویوں اور ایران و ہندوستان کی مسلم حکومتوں کا تذکرہ بھی ہے، مصنف نے گذشتہ صدیوں کی بعض اہم شخصیتوں کا اجمالی تعارف اور اس صدی کی اصلاحی تحریکوں اور مختلف ملکوں میں طلبہ کی اسلامی تحریکوں کا ذکر بھی کیا ہے، اور سیاسی واقعات کی طرح علمی، ادبی اور تمدنی کارنامے بھی بیان کیے ہیں، لیکن یہ تصویر دھندلی ہے، یہ کتاب پندرہویں صدی ہجری کی مناسبت سے شایع کی گئی ہے تاکہ مسلمان اپنی گذشتہ تاریخ سے واقف ہوکر سبق حاصل کریں۔

"ض"

جلد ۱۲۸ ماہ شوال المکرم ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۸۱ء عدد ۲

## مضامین



## مقالات



## ادبیات

# شذرات

۶-۷ اگست ۱۹۸۱ء کو دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کا سالانہ جلسہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی صدارت میں ہوا جس سے اس احاطہ میں بڑی رونق اور چہل پہل رہی، معزز اراکین سے اس کے خدمت گذاروں کو ہر قسم کا استفادہ کرنے کا موقع ملا۔

---

مجلس انتظامیہ میں کچھ جگہیں خالی ہو گئی تھیں، ان پر جناب حکیم عبد الحمید صاحب (ہمدرد دواخانہ دہلی) جناب محامد علی عباسی صاحب ریٹائرڈ آئی۔ اے۔ ایس (حیدر آباد) اور جناب حافظ محمد یوسف صاحب کوکن عمری (مدراس) کا انتخاب ہوا، اس جلسہ میں ایک بہت ہی اہم تجویز یہ بھی منظور ہوئی کہ ۲۱-۲۲ فروری ۱۹۸۲ء کو دار المصنفین میں ایک بین الاقوامی سمینار "اسلام اور مستشرقین" کے موضوع پر ہو جس میں بیرونی ممالک کے فضلا کو مدعو کر کے اس پر مفید اور سیر حاصل بحث کی جائے، مستشرقین کے رول پر معارف کی زیر نظر اشاعت میں کچھ مباحث ناظرین کی نظروں سے گذریں گے، یہ تحریریں آج سے تقریباً پچاس سال پہلے کی ہیں، اس عرصہ میں اور بہت مستشرقین پیدا ہوئے جنھوں نے اسلام اور اسلامی موضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے، سمینار میں گذشتہ او موجود تمام مستشرقین کا جائزہ اس حیثیت سے لیا جائیگا کہ ان کی قلمی کاوشوں اور علمی ہنگامہ آرائیوں سے فوائد زیادہ پہونچے یا نقصانات، اس سمینار میں جو مقالات پڑھے جائیں گے وہ دار المصنفین کی طرف سے کتابی شکل میں بھی شائع ہوں گے۔

---

گذشتہ ایک سال کے اندر مراد آباد، بہار اور حیدر آباد میں ہندو مسلمان کے جو خونین اور ہولناک فسادات ہوئے ان پر انسانیت روئی، ہر محب وطن کی گردن شرم سے جھکی، بیرونی ممالک میں



رسوائی بھی ہوئی، اب نہ صرف ہماری حکومت بلکہ اس ملک کے ہر خیر خواہ شہری کو بڑی سنجیدگی سے غور کرنا ہے کہ آخر ان بلووں کے اسباب کیا ہیں خطا ہیں اور خطا کار لوگ تو ایک دوسرے پر الزام تراشی کر کے عہدہ برآ ہوتے آرہے ہیں اور ہوتے رہیں گے، مگر خطا بینی یا خطا پوشی اس مسئلہ کا مستقل حل نہیں، پہلے برطانوی حکومت کے زمانہ میں ہر شخص کی زبان پر ہوتا کہ یہ انگریز لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی کی خاطر ہندو مسلم فساد کراتے رہتے ہیں، اب تو وہ چلے گئے، مگر ان کے عہد سے زیادہ بلوے ہونے لگے ہیں، لندن کے ایک انگریز مصنف نے لکھا ہے کہ ان بلووں کے اعداد و شمار جمع کئے جائیں تو یہ معلوم ہوگا کہ ہر تیسرے دن یہاں بلوہ ہوتا ہے۔

---

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تقسیم ہند کی وجہ سے ہندو مسلمان میں باہمی منافرت پیدا ہوئی اور یہی منافرت بلوے کی شکل میں نمودار ہوتی رہتی ہے، ہندوؤں میں اگر انتقامی جذبہ ہندوستان کی تقسیم سے پیدا ہوا تو انھوں نے اس تقسیم کا بدلہ پاکستان کے خلاف بنگلہ دیش کی حمایت کر کے فطری طور پر لے لیا جس کے بعد یہ انتقامی جذبہ کم ہونا چاہئے۔

---

برطانوی عہد کے بلووں کے اسباب کا تجزیہ اس زمانہ کے مشہور ہندو مسلمان دونوں رہنما کیا کرتے رہے گاندھی جی نے فروری ۱۹۲۵ء کے ینگ انڈیا میں لکھا کہ مسلمان ہندو اکثریت سے صرف اسلئے خائف ہیں کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہندوؤں نے انکے ساتھ ہمیشہ غیر منصفانہ برتاؤ کیا، انکے مذہبی جذبات کا احترام نہیں کیا، ہندو مسلمانوں سے اسلئے خوفزدہ ہیں کہ جب کبھی مسلمانوں کے ہاتھ میں قوت آئی تو انھوں نے ہندوؤں کے ساتھ نہایت سختی کا برتاؤ کیا اگرچہ ہندوؤں کی اکثریت تھی لیکن مٹھی بھر حملہ آوروں نے انکو مغلوب کر دیا، اس ملک میں اسی تجربہ کے دوبارہ پیش آنے کا خطرہ ہے، اور مسلمان لیڈروں کی سچائی اور خلوص کے باوجود مسلمان حملہ آوروں سے انکا مل جانا یقینی ہے، اسی بات کو گاندھی جی نے ۱۴ مئی ۱۹۲۵ء کے ینگ انڈیا میں یہ لکھ کر دہرایا کہ ہندو مسلمانوں میں ایک دوسرے پر ہنوز بے اعتمادی موجود ہے بہت سے ہندوؤں کو مسلمانوں کی راست بازی پر بھروسہ نہیں ہے وہ سمجھتے ہیں کہ سوراج کے معنے مسلمان راج کے ہیں اور یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ برطانیہ کی عدم موجودگی میں

مسلمانانِ ہند بیرونی مسلم طاقتوں کی امداد کرینگے تاکہ وہ ہندوستان میں اسلامی سلطنت قائم کریں، اس کے برعکس مسلمان خوفزدہ ہیں کہ ہندوؤں کی زبردست اکثریت ان کا گلا گھونٹ دیگی۔

اسی طرح لالہ لاجپت رائے کا ایک خط ۲۰ فروری ۱۹۲۰ء کے اخبار مرہٹہ میں شایع ہوا، جس میں انھوں نے اپنے اس شک کا اظہار کیا کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کے ساتھ افغانستان، وسط ایشیا، عرب، عراق اور ترکی کے مسلح غول ایسے ہونگے جن کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا، رابندر ناتھ ٹیگور کا ایک بیان ۱۸ اپریل ۱۹۲۴ء کے ٹائمس آف انڈیا میں شایع ہوا جس میں انھوں نے اپنے شکوک کا اظہار کیا کہ کوئی مسلمان قوت ہندوستان پر حملہ کر بیٹھے تو یہاں کے مسلمان اس مشترکہ زمین میں اپنے ہندو ہمسایہ کے دوش بدوش نہیں ہوں گے۔

ان بے جا شکوک سے ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بدگمانی پیدا ہوتی رہی، مگر ۱۹۴۷ء کے بعد شیخ عبداللہ نے کشمیر کو ہندوستان کا اٹوٹ انگ بنا کر اس بدگمانی کو دور کرنے میں عملی ثبوت دیا، پھر پاکستان سے جو دو لڑائیاں ہوئیں ان میں بریگیڈیر عثمان اور عبدالحمید کی وطن دوستی، جانبازی اور پامردی کو حکومت ہند نے اچھال کر اسکا اعتراف کیا کہ مسلمان اپنے ملک کے کیسے وفادار ہوسکتے ہیں، اس زمانہ کے اخباروں میں یہ بھی پڑھنے میں آیا کہ پاکستان کے محاذ جنگ پر ایک بھائی اپنے سگے بھائی کے خلاف لڑتا رہا، بنگلہ دیش کے مسلمانوں نے تو پاکستان کے خلاف ہندوستان ہی سے مل کر جنگ کی، پھر آج بھی افغانستان پاکستان کے بجائے ہندوستان کا عظیم ترین اور مخلص ترین حلیف اور دوست بنا ہوا ہے، اسلامی ممالک میں ہندوستان کا جو اثر اور رسوخ ہے وہ پاکستان کا نہیں، پھر مسلمانوں کے خلاف برطانوی عہد میں جو بداعتمادی پھیلائی گئی تھی، وہ ظاہر ہے کہ کیسی بے بنیاد بات ثابت ہوئی۔

اسی طرح کی بداعتمادی مسلمانوں میں بھی رہی، سر عبدالرحیم نے ۱۹۲۵ء میں علی گڈھ میں مسلم لیگ کی صدارت کی تو اپنے خطبہ میں کہا کہ ہندو تاریخ کے صفحات کو مسخ کر رہے ہیں، اور یہ ثابت کرنے کی جستجو میں ہیں کہ



اسلام سے ہندوستان کو کبھی کوئی نفع نہیں پہونچا، اور یہ یاد کرا رہے ہیں کہ مسلم قوم نہایت ناکارہ ہے اور ایسے افراد سے مرکب ہے جو مبتذل ترین ہندوؤں کے بھی ہم پلہ نہیں ہیں، مولانا احمد سعید جمعیۃ العلماء کے روح رواں بن کر برابر کانگریس کے ہمنوا رہے، مگر دسمبر ۱۹۲۶ء میں انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ صاف اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہندوؤں کے معاندانہ اور مخاصمانہ طرز عمل سے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ ہندوؤں کی جانب سے مایوس ہوگیا ہے، ان چند برسوں میں ہندوؤں نے جو مظالم کئے اور جس بے دردی کے ساتھ مسلمانوں کے مذہب کی توہین کی اور انکے جائز حقوق کو پامال کیا ہے، پھر باوجود مسلمانوں کی انتہائی خوشامد اور رواداری کے ہندوؤں نے مسلمانوں کے مطالبات کو جس طرح ٹھکرایا ہے اور ہندو لیڈروں نے باایں ہمہ ان مظالم اور خونریزی کی جس طرح پردہ پوشی کی ہے بلکہ حمایت کی ہے، ان تمام باتوں نے ہندوؤں کے اعتماد کو کھو دیا ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی نے کانگریس کا ساتھ دینے میں مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ کی مخالفت مول لی، انھوں نے ستمبر ۱۹۲۶ء میں اپنے ایک خط میں لکھا کہ آزادیِ کامل ہمارا مذہبی، سیاسی اور وطنی نصب العین ہے، ہر حیثیت سے ہم کو اسکے لیے کوشش کرنی چاہیے، مگر اسی کے ساتھ ہم اپنے مذہب و قوم کو ضروری سمجھتے ہیں بلکہ آزادی کو مذہب اور قوم کی وجہ سے ڈھونڈتے ہیں، اگر خدانخواستہ مذہب برباد ہوجائے تو ایسی آزادی سے کیا فائدہ، مسلمان ہندوستان میں اقلیت میں ہیں، اور ہندو اکثریت میں، ان کی اکثریت غیر معمولی ہے، تین اور ایک کی نسبت ہے، انکی یہ حالت ہے کہ آج تک ڈاکٹر مونجے یہی فرما رہے ہیں کہ یہ سرزمین کسی مسلمان یا کسی فرقہ کی نہیں، جو راج قائم ہوگا وہ ہندو راج ہوگا، جو مظالم آئے دن دفتروں، شہروں اور ریاستوں میں کئے جا رہے ہیں اور جس تعصب اور عدم رواداری کا ثبوت دیا جاتا ہے اسکی بنیاد پر ہم کسی طرح بھی اپنے ابنائے وطن سے متحدہ قومیت کی توقع نہیں کر سکتے۔

اسی زمانہ میں مولانا محمد علی نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ ہندو سوراج کے جنگی نعرے سے لیس ہوکر اٹھے ہیں، تو وہ مسلمان کو یہاں پناہ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں تاوقتیکہ مسلمان اپنی انفرادیت کو خیرباد کہہ کر ہندو تمدن اختیار نہ کرلیں، ہندو مسلمان کو قابلِ توجہ نہیں سمجھتے، اس کے برخلاف مسلمان نیشنلزم کو سراب نہیں تو

دعوکا ضرور تصور کرتے ہیں لیکن ان سب باتوں کے باوجود بڑے اہتمام سے اس مفروضہ کو قائم رکھا جاتا ہے، کہ ہماری اغراض مشترک ہیں، ہندو پریس قومی اتحاد کے متعلق گمراہ کن اصطلاحات کا سہارا لینے میں پیش پیش ہے، گویا ہندو مسلمان میں تصورات، احساسات، نقطہ ہائے نگاہ میں کسی بنیادی اختلاف کا وجود ہی نہیں، مولانا محمد علی نے لندن میں گول میز کانفرنس کے موقع پر اپنے آخری خط میں یہ بھی لکھا کہ آج کچھ ہندو کچھ سکھ، کچھ مرہٹے اور کچھ راجپوت ایسے ہیں جو ہندوستان کے گذشتہ مسلمان حکمرانوں کا بدلہ ہندوستان کے موجودہ مسلمانوں سے لینا چاہتے ہیں۔

---

ان مسلمان رہنماؤں کے بیانات صحیح تھے یا غلط لیکن یہ حقیقت ہے کہ دونوں فرقوں میں بداعتمادی بڑھتی ہی جس کا نتیجہ تقسیم ہند میں نمودار ہوا، پھر پاکستان بھی تقسیم ہوا تاریخ کو جو فیصلہ کرنا تھا کر چکی، اب سوچنا یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر محب وطن کو کیا کرنا ہے،

---

اکبری عہد میں ابوالفضل نے بڑے دکھ اور درد کے ساتھ ہندو مسلمانوں کو سامنے رکھ کر لکھا تھا، کہ بنی نوع انسان کے مختلف طبقات میں بے رنگی اور مخالفت پائے جانے کے اسباب یہ ہیں کہ ایک دوسرے کے باہمی خیالات سے لاعلم ہوتے ہیں، اس لاعلمی نے دشمنی کا سنگ بنیاد رکھ کر دنیا کو شورش کی گرد سے غبار آلود کر دیا ہے، کوئی واسطہ ایسا پیدا نہیں کیا جاتا جو باہمی بے رنگی کو مٹائے، اس بے رنگی کی وجہ سے نفس پرست بنے آنکھوں کے اندھے اور کانوں کے بہرے ہوتے گئے، وہ اصلی تحقیق و تفتیش کی تکلیف گوارا نہیں کرتے، دشمنی اور عداوت کی ہوا اتنی تیز ہے کہ دو تین افراد بھی ایسے نہیں جو ایک جگہ بیٹھ کر تبادلہ خیالات کریں، اور مہر محبت کی فضا قائم کرنے میں معاون ہوں، خود بینی کا ایسا دور دورہ ہے کہ ہر فرد نے اپنی ہی جماعت کو مخلوق خدا خیال کر لیا ہے، اور دوسرے کو بندگی کے دائرہ سے خارج کر کے خونریزی، آبروریزی اور مردم آزاری کو مذہبی فریضے میں داخل کر لیا ہے، یہ مخلوق خدا کو دھوکا دینا ہی، اور خود نمائی سے اپنے کو حقیقی اور صادق رہنما سمجھنا بد طینت ہونے کی دلیل ہے،

---



یہ راقم بار بار لکھ چکا ہے کہ ابوالفضل نے چار سو برس پہلے جو کچھ لکھا تھا اس کا اطلاق اب بھی ہوتا ہے اور یہ یقین کرنے کو جی چاہتا ہے کہ ہندوستان اپنی اخلاقی حالت میں جیسا پہلے تھا، اب بھی ویسا ہے، اور اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کی مہم سیاسی لیڈروں کے ہاتھوں میں رہی، جو اس اتحاد کی بنیاد اپنے سیاسی مفاد کی خاطر قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے، اگر اس کی مہم سچے محبان وطن، خیر خواہ مصلحین قوم، بے غرض اور بے لوث رہنمایان ملک کے ہاتھوں میں ہوتی تو وہ یقیناً اس سرزمین میں ایسی فضا قائم کرنے میں کامیاب ہوتے کہ یہاں کے رہنے والوں کا روشن اور زریں مستقبل باہمی رواداری، فراخ دلی، وسیع چشمی، محبت، یگانگت اور موانست میں ہے، نہ کہ باہمی خونریزی، خانہ جنگی، آبروریزی، مردم آزاری خود پروری، نفرت، عداوت اور حقارت میں ہے،

---

اس فضا کو قائم کرنے کی زیادہ ذمہ داری ہندوؤں ہی پر آتی ہے، کیونکہ وہ صاحب اقتدار و حکومت ہونے کے علاوہ متحدہ قومیت کے بھی مبلغ اور علم بردار ہیں، ۱۹۵۳ء میں

---

مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوؤں کو مخاطب کر کے پارلیمنٹ میں فرمایا تھا، وہ خود قد آور بننا چاہتے ہیں تو ضرور بنیں، مگر دوسروں کو ٹھگنا بنا کر رکھنے کی کوشش نہ کریں، ہندوؤں کو اپنے ساتھ اپنی اقلیتوں کو بھی قد آور بنانے کی فضا پیدا کرنی چاہئے، اور یہ فضا قائم نہ ہو سکی، تو پھر انڈولوجی کا عظیم ترین ہمدرد اور دوست ابوریحان البیرونی کی یہ بات کہیں آج بھی صحیح ثابت نہ ہو جائے کہ ہندو ان کے تمام تر تعصب کا نشانہ وہ لوگ بنتے ہیں، جو ان میں نہیں، یعنی جو نو وارد (مسلمان) ہیں، وہ انھیں ملچھ کہتے ہیں جس کے معنی ہیں گندے یا ناپاک، ان سے کسی قسم کا واسطہ نہیں رکھتے، نہ ان سے ازدواجی تعلق قائم کرتے ہیں اور نہ کسی قسم کا تعلق، نہ ان کے ساتھ مل بیٹھنے پر رضامند ہوتے ہیں، نہ کھانے اور پینے پر کیونکہ ایسی صورت میں وہ سمجھتے ہیں کہ پلید ہو جائیں گے، ان کے نزدیک ہر وہ شے پلید ہے جسے مسلمانوں کی آگ یا پانی نے چھوا ہو، اور یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی حکمران دو

نظری عناصر کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا، انھیں کسی غیر ہندو کو اپنے ہاں بلانے کی اجازت نہیں اگرچہ غیر ہندو اس دعوت کا کتنا ہی خواہش مند ہو یا ان کے مذہب کی طرف مائل ہی کیوں نہ ہو، ان حالات میں ان میں اور مسلمانوں میں کسی قسم کا تعلق قائم ہو سکنا قطعی ناممکن ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان ایک ایسی خلیج ہے، جو عبور نہیں کی جا سکتی

آزاد ہندوستان میں یہ خلیج بڑی حد تک عبور ہو چکی ہے، کچھ اور عبور کرنے کی ضرورت ہے، مولانا محمد علی نے کوکناڈا کانگریس میں اپنے خطبۂ صدارت میں جو دعا مانگی تھی، وہ سچے دل سے اب بھی مانگنے کی ضرورت ہے کہ

"اے اتفاق تو ضرور آئے گا، ہندو مسلمان کو باہم ملا دے گا، ان کو متحد کر دیگا، لیکن آج ہمارے سامنے نہیں ہے جو تیرے انتظار کی تکلیف اٹھا رہے ہیں، تو آئے گا ضرور لیکن کب؟ ایک عرصہ کی مصیبتوں، صبر آزما التماسوں، اور ہمت شکن انکاروں کے بعد؟"

---

مذہبی تعلیم کے حلقہ میں یہ خبر خوشی سے سنی جائے گی کہ اس ملک بلکہ عالم اسلام کے مشہور دینی عالم جناب ابو المآثر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی نگرانی میں مئو ضلع اعظم گڈھ میں المعہد العالی کے نام سے ایک مخصوص نوعیت کی درسگاہ قائم کی گئی ہے، جس میں مدارس عربیہ کے لیے آسانی سے اساتذہ فراہم کرنے کی خاطر ان کو اعلیٰ تربیت دی جائے گی، اس میں تین شعبے رکھے گئے ہیں، تخصص فی علوم القرآن، تخصص فی علوم الحدیث، تخصص فی الفقہ الاسلامی، اس کی ابتدا، تخصص فی الفقہ الاسلامی میں آٹھ فضلاء کے داخلہ سے کر دی گئی ہے، اسی کے ساتھ بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے مرقاۃ العلوم اور حفظ قرآن اور تجوید کیلئے دار تحفیظ القرآن کا قیام بھی عمل میں آیا ہے، امید ہے کہ ان مفید درسگاہوں کی طرف دینی درد رکھنے والے ارباب جدول پوری توجہ کریں گے، تاکہ یہ اپنے بلند مقاصد میں ہر طرح کامیاب ہوں۔

---



# مقالات

## جناب مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی یاد میں

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۵)

**دار المصنفین کی حاضری**

۱۹۳۳ء میں میرا داخلہ علی گڑھ کے ٹریننگ کالج میں حضرت سید صاحبؒ کی سفارش سے ہوا تھا، اس لیے وہاں جاتے ہوئے اعظم گڈھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا، دار المصنفین کے احاطہ میں داخل ہوتے ہوئے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا ذرہ ذرہ مجھ کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے، آم اور امرود کے درخت ہر طرف لگے ہوئے تھے، ان کی ہر ڈالی میں کشش محسوس کی، اس کی مسجد اور اس کی ہر عمارت مجھ کو بہت ہی بھلی نظر آئی، اس کے احاطہ کی صفائی اور ستھرائی سے بھی متاثر ہوا، شام کو پہونچا، سید صاحبؒ کا ذاتی مہمان تھا، اس لیے ان کی خدمت میں حاضری دی، ان کے زنانخانہ کے بیرونی کمرہ میں داخل ہوا تو اس کو سادگی لیکن پرکاری کا نمونہ پایا، زمین پر فرش بچھا ہوا تھا، اس پر ایک عمدہ و دبیز پھولدار قالین پڑا ہوا تھا، جس سے کمرہ کی زینت بڑھ گئی تھی، اس میں ایک مسہری بھی تھی، جس کا بستر بہت ہی صاف تھا، اس پر سید صاحبؒ رات کو آرام فرماتے، اسی کے پاس ایک بہت بڑا اگالدان رکھا ہوا تھا، کمرہ کی دیواروں پر چوکھٹوں میں امجد حیدر آبادی کی کچھ رباعیاں آویزاں تھیں، کمرہ کے بغل میں غسل خانہ تھا، جو صفائی میں

چمکتا دمکتا نظر آیا، وہاں ہر چیز سلیقہ سے رکھی ہوئی تھی، عشاء کی نماز کے بعد احاطہ کے تمام لوگ ایک دسترخوان پر اکٹھے ہوئے، سید صاحبؒ کے علاوہ مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبد السلام ندوی، جناب محمد عزیر صاحب، جناب شاہ معین الدین احمد ندوی، جناب سید ریاست علی ندوی، مولوی محمد یوسف کوکن عمری اور جناب نیاز احمد صدیقی صاحب تھے، سید صاحب کے مکان کے سامنے ایک چبوترے پر صحن میں دسترخوان بچھا ہوا تھا، سب کے گھروں سے الگ الگ کھانا آیا جس میں بڑا تنوع تھا، دسترخوان کے پاس آدھے درجن ملازم خدمت کے لیے خاموش کھڑے ہوئے تھے، میں نے سید صاحبؒ کے علاوہ ان میں ہر شخص کو پہلی دفعہ دیکھا، سید صاحب کی سفید داڑھی میں خضاب لگا ہوا تھا، وہ سنجیدگی اور متانت کے پیکر نظر آئے، بڑے وقار کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھے تو وہ میری نظر میں اس وقت علم کے پہاڑ معلوم ہوئے، مولانا مسعود علی ندوی کا جسم بہت ہی بھاری تھا، مگر توانا اور چست دکھائی دیے، وہ دسترخوان کے پاس پہونچے تو تمام لوگ اظہار تعظیم کے لیے کھڑے ہوگئے، انھوں نے ملازموں کی طرف نگاہ اٹھائی تو وہ سب بھی باادب ہوگئے، وہ دسترخوان پر سید صاحبؒ کے بغل میں آکر بیٹھے، ان کے سامنے سید ریاست علی ندوی صاحب نے جگہ لی، اور ان کے پاس ہی مولانا عبد السلام ندوی تھے، جو مجھ کو بہت ہی سیدھے سادے، اور تمام آداب سے بے نیاز معلوم ہوئے، ان کے سامنے جناب محمد عزیر صاحب آکر بیٹھے، جو علی گڑھ کے ایم۔ اے، ال ال بی وکیل تھے، اعظم گڈھ میں وکالت شروع کی تھی، جناب سید نجیب اشرف صاحب ندوی دارالمصنفین سے چلے گئے تو وہ ان کی جگہ پر یہاں آگئے تھے، ان کی وضع قطع سے ظاہر ہوا کہ بہت ہی صفائی پسند ہیں، چہرہ منور تھا، جس پر تھوڑی تھوڑی داڑھی تھی، ان ہی کے پاس جناب **شاہ معین الدین احمد ندوی** تھے جن کی عمر اس وقت اکتیس برس کی تھی، شکیل اور وجیہ نظر آئے، ان کے چہرے پر بھی تھوڑی تھوڑی داڑھی تھی بالکل ہی سیاہ، چہرہ کا رنگ بہت ہی صاف بلکہ گورا تھا، جس پر ان کی سیاہ داڑھی بہت ہی اچھی معلوم ہوئی، جسم



بھاری تو نہیں لیکن بھرا ہوا ضرور تھا، تن زیب کا کرتہ زیب تن کیے ہوئے تھے، جو ان کے جسم پر خوب کھلتا تھا، آنکھیں بڑی بڑی تھیں، دسترخوان پر سید صاحبؒ اور مولانا مسعود علی کے بعد وہی نمایاں نظر آئے، جناب یوسف کوکن صاحب مدراس کے مدرسۃ دار السلام عمرآباد سے یہاں تصنیف و تالیف کا سلیقہ سیکھنے کے لیے بھیجے گئے تھے، ابن تیمیہؒ پر کام کر رہے تھے، یہاں رہ کر کلام پاک بھی حفظ کیا، انٹرمیڈیٹ اور بی۔ اے بھی پاس ہوئے، یہاں سے واپس گئے تو مدراس یونیورسٹی میں لکچرر ہوگئے، پھر وہاں کے شعبۂ عربی و فارسی و اردو کے صدر بھی ہوئے، وہ اس وقت بہت ہی کمسن تھے، نیاز احمد صدیقی صاحب ایم۔ اے، ال ال بی، ال ٹی پروفیسر رشید احمد صدیقی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے چھوٹے بھائی ہیں، وہ شبلی اسکول میں انگریزی پڑھاتے تھے، شبلی منزل ہی کے احاطہ میں رہتے تھے، بڑے متواضع اور خاکسار نظر آئے، کھانا پورے آداب کے ساتھ شروع ہوا، جناب شاہ معین الدین احمد ندوی بہت ہی جلد کھا کر فارغ ہوگئے، اور منھ میں پان ڈال لیا، کھانے کے درمیان کچھ نہ کچھ گفت گو ہوتی رہی، لیکن اصل گفتگو کھانے کے بعد شروع ہوئی، مولانا مسعود علی ندوی پان کے کئی بیڑے کھاتے رہے، جیسے جیسے ان کے منھ میں پان کی لذت بڑھتی گئی، ویسے ہی ان کی باتوں میں آب و رنگ پیدا ہوتا گیا، مجھ کو پہلی دفعہ ان کی گفت گو سننے کا موقع ملا تھا، سید صاحب ان کے سامنے ساکت و صامت بیٹھے رہے، مولانا مسعود علی ندوی بلبل ہزار داستان بنے ہوئے تھے، مولانا عبد السلام ندوی اس طرح بیٹھے نظر آئے جیسے وہ کہیں اور ہیں، وہاں موجود نہیں ہیں، سید ریاست علی صاحب بھی خاموش تھے، صرف کبھی کبھی زور سے ہنس دیتے، محمد عزیر صاحب مولانا مسعود علی ندوی کی باتیں ہمہ تن گوش ہو کر سن رہے تھے، مولانا کا سارا روئے سخن ان ہی کی طرف تھا، البتہ شاہ صاحبؒ بیچ بیچ میں کوئی اچھا فقرہ یا جملہ کہہ کر خود ہی قہقہہ لگا دیتے، میں پہلے سن چکا تھا کہ مولانا مسعود علی ندوی بڑی اچھی گفت گو کرتے ہیں، جس مجلس میں ہوتے ہیں کسی اور کو بولنے نہیں دیتے، جو کچھ سنا تھا صحیح پایا، ان کی باتوں میں بڑا تنوع تھا، شام کو ٹینس

کھیل کر واپس آئے تھے، اپنے کھیل کا ذکر کیا، شہر کی خبریں سنائیں، ملک کی سیاست پر تبصرہ کیا، ان کی باتوں میں بڑا ظریفانہ رنگ تھا، اس لیے وہ قہقہوں میں سنی گئیں، جب ان کے پان کے بیڑے ختم ہوگئے تو وہ اٹھ گئے، پھر سب ہی رخصت ہونے کے لیے تیار ہوگئے، ان سے پہلے کوئی نہیں اٹھا، دوسرے دن فجر کی نماز کے بعد صبح کے ناشتہ کے لیے دسترخوان پر اسی طرح جمع ہوئے، مولانا مسعود علی ندوی صبح کو ایک میل تک ٹہلنے کے لیے گئے تھے، ان کا انتظار رہا، ناشتہ کے بعد پھر ان کی گفتگو شروع ہوگئی، وہی ظریفانہ رنگ تھا، جس کے درمیان صرف شاہ صاحب کچھ بولتے، ناشتہ کے بعد سب کتب خانہ میں جا کر اپنے کمروں میں مشغول ہوگئے، بارہ[12] بجے دن کو دوپہر کے کھانے کے لیے پھر سب اکٹھے ہوئے اور کھانے کے بعد مولانا مسعود علی ندوی کی گفتگو کے لیے ہمہ تن گوش ہوئے، قیلولہ کے لیے سب ہی اپنی قیام گاہوں میں چلے گئے، سید صاحبؒ، مولانا مسعود علی ندوی اور سید ریاست علی ندوی صاحب کے لیے علیحدہ علیحدہ زنانخانے بنے ہوئے تھے، شاہ صاحبؒ بیوی بچوں کے ساتھ نہیں رہتے تھے، اس لیے ان کا کوئی زنانخانہ نہ تھا، ایک کمرہ میں ضروری سازوسامان کے ساتھ رہتے تھے، ان کی چارپائی کے پاس ایک میز تھی، جس پر ان کا پاندان رکھا رہتا، جو ان کی اور مولانا عبدالسلام ندوی کی مشترکہ ملکیت تھی، دونوں اسی سے پان کے بیڑے خود بناتے، اس زمانہ میں شاہ صاحبؒ ترکی ٹوپی پہنتے، وہ میز ہی پر رکھی رہتی، دیوار پر ان کی ایک شیروانی لٹکی ہوئی تھی، اسی کے نیچے ایک ٹرنک اور ایک سوٹ کیس رکھا تھا، جس میں ان کے کپڑے اور کچھ ضروری سامان ہوتا، ان ہی کے کمرہ سے ملا ہوا جناب نیاز احمد صدیقی کا کمرہ تھا، دونوں ایک جان دو قالب بنے ہوئے تھے، اور دوسرے حضرات کے لیے الگ الگ کمرے تھے، ظہر کی نماز کے لیے سب مسجد میں جمع ہوئے، کوئی باضابطہ موذن اور امام نہ تھا، جو پہلے پہونچ جاتا، وہی اذان دے دیتا، سری نمازوں کی امامت زیادہ تر سید صاحب کرتے، جہری نمازوں کے لیے مولوی محمد یوسف کوکن کو بڑھا دیا جاتا، ظہر کی نماز کے بعد سب کتب خانہ میں اپنے کمروں میں جا کر مشغول ہوگئے، عصر کی



اذان سن کر سب مسجد میں آگئے، نماز کے بعد سید صاحب کے برآمدے میں جانے کے لیے جمع ہوئے، جب تک مولانا مسعود علی وہاں بیٹھے رہے، کوئی اور کچھ نہ بولا، وہ ٹینس کا بلا لے کر چلے گئے تو سید صاحب کی گفتگو شروع ہوگئی، یہ زیادہ تر علمی تھی، رفقاء سے ان کے کام کی تفصیل پوچھی، ان کو اپنے مشوروں سے مستفید کیا، اس موقع پر زیادہ تر شاہ صاحبؒ ہی بولتے رہے، مغرب سے پہلے یہ نشست ختم ہوگئی، پھر کچھ دیر کے بعد سب مسجد میں جمع ہوگئے، عشاء کی نماز کے بعد پھر رات کے کھانے کے لیے دسترخوان پر جمع ہوئے۔

**دارالمصنفین کا شباب**

دو[2] روز دارالمصنفین میں رہ کر علی گڑھ کے لیے روانہ ہوگیا، دارالمصنفین کی زندگی سے بے حد متاثر ہوا، اور یہ خیال ذہن پر چھا گیا کہ میں بھی اس بزم میں شریک ہو جاتا تو میں اپنے کو بہت خوش قسمت سمجھتا۔

پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو یہ زمانہ دارالمصنفین کے پورے شباب کا تھا، سید صاحب کی دروس الادب، سیرت عائشہؓ، ارض القرآن، سیرۃ النبیؐ کی چار جلدیں، خلافت، خلافت اور ہندوستان، عرب ہند کے تعلقات، خطبات مدراس، خیام اور عربوں کی جہاز رانی وغیرہ شایع ہو چکی تھیں، دروس الادب عربی کی ریڈریں ہیں، مگر وہ اتنی مقبول ہوئیں کہ اس کے ہر سال کئی کئی اڈیشن نکلے، سیرت عائشہؓ سے بہتر اب تک حضرت عائشہؓ پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، ڈاکٹر اقبالؒ نے اس کو پہلی دفعہ پڑھا تو سید صاحبؒ کو لکھ بھیجا کہ یہ سیرۃ سلیمانی ثابت ہوئی، ارض القرآن میں عرب سے متعلق جو جغرافیائی معلومات فراہم کر دیے گئے ہیں، وہ اپنی مثال آپ ہے، اسی کی معلومات کو لے کر دوسرے اسکالر بہت کچھ لکھ رہے ہیں، سیرۃ النبیؐ کی جو جلدیں دارالمصنفین سے شایع ہوئی ہیں، وہ تو سیرت پاک کی شاہکار ہیں، شاید مدت مدید تک ان سے زیادہ جامع مفصل اور محققانہ سیرت کوئی اور کسی زبان میں نہ لکھ سکے گا، ۱۹۱۹ء میں خلافت کی ہنگامہ پرور تحریک چلی تو اس میں سید صاحبؒ کے دو[2] رسالے خلافت اور خلافت اور

ہندوستان کی وجہ سے اس میں علمی رنگ پیدا ہوگیا، "عرب و ہند کے تعلقات" ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے خطبے ہیں، مگر یہ ایسے مقبول ہوئے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ان خطبوں کو سن کر کہا تھا کہ یہ دنیا کی کسی قوم کے لیے بھی باعث فخر ہو سکتے ہیں، خطبات مدراس میں سید صاحب نے آستانۂ رسالت میں اپنی بے پناہ عقیدت کے جو پھول چڑھائے ہیں، ان کی شادابی اور رعنائی ہمیشہ باقی رہے گی، یہ ان کی انشاء پردازی کے شاہکار بھی ہیں، ان کی خیام پڑھ کر ڈاکٹر اقبال نے بجا طور پر کہا تھا کہ اس میں جو تحقیقات ہیں ان پر کوئی مستشرق کوئی اضافہ نہ کر سکے گا، ان کی "عربوں کی جہاز رانی" بھی ان کی تحقیق و دیدہ وری کی ایک بڑی مثال ہے، ان کتابوں کے علاوہ وہ معارف میں جو مضامین لکھتے تھے، ان میں ان کی تحقیقی کاوش بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی، ان کے شذرات تو واقعی سونے کے ٹکڑے سمجھے جاتے۔

اس وقت تک مولانا عبد السلام ندوی کی شعر الہند حصہ اول و دوم، اسوۂ صحابہ حصہ اول و دوم، سیرت عمر بن عبد العزیزؒ، اسوۂ صحابیات اور انقلاب الامم وغیرہ بھی نکل چکی تھیں، شعر الہند اردو کی ان کتابوں میں سے ہے جن کے مطالعہ سے ادبی ذوق کی نشو و نما ہوئی، اردو شاعری اور شعراء کو سمجھنے کے لیے اس کے دونوں حصوں کا پڑھنا ناگزیر ہے، جس وقت نظر سے یہ دونوں جلدیں لکھی گئی ہیں وہ اب کسی ادیب یا مصنف کی تحریروں میں مشکل سے نظر آتی ہے، ان کی اسوۂ صحابہ کی دو[2] جلدوں میں اسلام کی وہ سچی تعلیمات ملیں گی جن سے ایمان میں تازگی اور جلا پیدا ہوتی ہے، ان کی سیرت عمر بن عبد العزیزؒ میں بنو امیہ کے اس فرماں روا کے اعلیٰ کردار کا جو مرقع سامنے آتا ہے وہ موجودہ دور کے حکمرانوں کے لیے مشعل راہ بن سکتا ہے، اسوۂ صحابیات گو مختصر سی کتاب ہے مگر اس میں اسوۂ صحابہ ہی کا رنگ ہے، انقلاب الامم فرانسیسی مصنف موسیو لیبان کی کتاب کا ترجمہ ہے، جس کو پڑھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اصل بہتر ہے یا اس کا ترجمہ، مولانا عبد السلام ندوی کے مضامین معارف میں بکثرت شایع ہو چکے تھے اور وہ شوق سے پڑھے جاتے۔



حاجی معین الدین ندوی کی دو کتابیں "خلفائے راشدین" اور "سیر المہاجرین" نکل چکی تھیں "خلفائے راشدین" تو دار المصنفین کی بڑی مقبول تصنیف سمجھی جاتی ہے، چاروں خلفاء کے حالات ایک جگہ مطالعہ کرنے سے اس عہد کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے، اسی طرح صحابۂ کرام کے حالات میں اور جلدیں ہیں، یہ دار المصنفین کا بڑا اہم سلسلہ ہے، جس کی تکمیل میں یہاں کے ایک سابق رفیق مولانا سعید انصاری نے بھی حصہ لیا، اور انھوں نے سیر انصار دو جلدوں میں اور سیر الصحابیات لکھی، جناب شاہ معین الدین ندوی نے تین[3] مزید جلدیں لکھ کر اس سلسلہ کو مکمل کیا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، مولانا ابو الحسنات ندوی نے "ہندوستان میں اسلامی درسگاہیں" لکھی، اور ابھی صرف یہی کتاب لکھنے پائے تھے کہ عین جوانی میں اللہ کو پیارے ہو گئے، مگر اس کتاب کی بدولت ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

یہاں سے مولانا محمد یونس فرنگی محلی کی "فہم انسانی"، "سوانح ابن رشد" مولانا عبد الباری ندوی کی "برکلے" اور "مبادی علم انسانی" اور مولانا عبد الماجد دریا بادی کی "مکالمات برکلے" شایع ہوئیں، تو ملک پر یہ اثر پڑا کہ دار المصنفین ٹھیٹھ مولویوں ہی کا ادارہ نہیں ہے، بلکہ یہ زمانے کے ساتھ ساتھ بھی چلنے کو تیار ہے، اسی طرح یہاں حکیم عبد الحیؒ کی "گل رعنا" نکلی تو "شعر الہند" کے ساتھ اس کتاب کی وجہ سے یہ شہرت قائم ہوئی کہ مولانا شبلی کی "موازنۂ انیس و دبیر" اور "شعر العجم" کی روایت بھی اس ادارہ میں باقی ہے، جناب سید نجیب اشرف ندوی کی "رقعات عالمگیر" اور "مقدمۂ رقعات عالمگیر" کی وجہ سے عالمگیر کی ذات سے مسلمانوں کو جو عقیدت تھی اس میں مزید اضافہ ہوا، مقدمۂ رقعات عالمگیر دار المصنفین کی اہم ترین مطبوعات میں شمار کی جاتی ہے۔

ان کتابوں میں مولانا شبلیؒ کے انداز بیان اور اسلوب تحریر کو حتی الامکان باقی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، اردو زبان کی یہ ساری مطبوعات نئی تھیں، اس لیے شوق سے پڑھی گئیں، جس سے دار المصنفین کا علمی و ادبی اور تحقیقی وقار تیزی سے بڑھ گیا تھا۔

رسالہ معارف کو بھی اس وقت تک بڑی شہرت حاصل ہوچکی تھی، کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر نکلسن نے اس کے مضامین سے متاثر ہوکر اس کے ناقدانہ علمی مباحث، مستشرقانہ معلومات اور مشرقی و مغربی علوم و معارف کی آمیزش کی داد دی اور ہندوستان کی علمی ترقی پر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

ڈاکٹر اقبال بھی معارف کو بہت پسند کرتے تھے، سید صاحب کو ایک خط لکھ کر یہ تحریر فرمایا:

"یہی ایک ایسا رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے"۔

مولانا محمد علی نے اس کے متعلق اپنے ایک مکتوب مورخہ ۴ر دسمبر ۱۹۱۹ء میں لکھا:

"میرے متعدد انگریزی رسالوں کی جلدیں نہیں بندھی ہیں، اور ممکن ہے کہ میرے عزیز دوست اور سارق کتب سید جالب صاحب ان میں سے اکثر پر قبضہ کر بیٹھے ہوں، یہ شرف خاص معارف کو حاصل ہوگا کہ مجلدات تیار کرالی جائیں گی"۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ بھی ایک خط میں سید صاحبؒ کو تحریر فرماتے ہیں:

"معارف کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں، صرف یہی ایک پرچہ ہے اور تو ہر طرف سناٹا ہے، بحمد اللہ مولانا شبلی مرحوم کی تمنائیں رائیگاں نہیں گئیں، اور صرف آپ کی بدولت ایک جگہ ایسی بن گئی جو صرف خدمت علم تصنیف و تالیف کے لیے وقف ہے"۔

معارف پریس کی عمدہ طباعت و کتابت کی بہت شہرت تھی، مولانا مسعود علی ندوی کی کوشش سے اچھے اچھے کاتب اور مصلح سنگ جمع ہوگئے تھے، منشی محمد اشتیاق، منشی محمد حسن، منشی عبدالحکیم، منشی عبدالحفیظ اور منشی عطاء اللہ کی وجہ سے لکھائی چھپائی بہت اچھی ہونے لگی تھی، منشی اشتیاق کے شاگردوں میں



منشی عبدالقادر، منشی محمد اقبال اور منشی محمد صدیق بھی بہت اچھے کاتب ہوئے، مولوی عبدالباری کو پروف پڑھنے کی تربیت دی گئی تو وہ اچھے پروف ریڈر ہوئے، دفتر میں اس وقت جناب محمد اویس وارثی صاحب تھے، جو حساب کتاب میں بڑے ماہر تھے، نہ صرف دارالمصنفین بلکہ شہر میں بھی بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے، دارالمصنفین کی ہر کتاب میں طابع و ناشر کی حیثیت سے ان ہی کا نام ہوتا، دفتر میں ان کے معاون جناب یحییٰ اعظمی تھے، جو اردو کے بڑے اچھے شاعر بھی تھے، سید صاحب معارف میں ان کا کلام برابر شایع کرتے رہتے، مولوی مسعود علی ندوی کے اہتمام میں سیرۃ النبیؐ آرٹ پیپر پر بہت ہی دیدہ زیب کتابت کے ساتھ چھاپی گئی، تو سارے ملک میں اس کی طباعت کے اعلیٰ معیار کو تسلیم کیا گیا، اس کی مطبوعات کا سائز ۲۶ × ۲۰ مخصوص رکھا گیا، ان کی نہ جلد بندی ہوتی، نہ ڈسٹ کور لگتا، پھر بھی کتابت و طباعت کے مخصوص انداز و معیار کی وجہ سے بہت پسند کی جاتیں، اور دور سے دیکھ کر لوگ سمجھ جاتے کہ یہ دارالمصنفین کی مطبوعات ہیں۔

دارالمصنفین اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے بھی ایک اہم مرکز بن گیا تھا، سید صاحبؒ نے ترک موالات اور خلافت کی تحریکوں میں پورا حصہ لیا تھا، 'خلافت' 'خلافت اور ہندوستان' جیسے دو رسالے لکھ کر خلافت کی تحریک میں علمی اور تاریخی رنگ پیدا کردیا تھا، مولانا محمد علی کے ساتھ وفد خلافت میں لندن بھی گئے، وہاں سے جو خطوط لکھتے وہ اخباروں میں چھپتے، تو بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے، خلافت کانفرنس اور جمعیۃ علماء کے اجلاس کی صدارت بھی کی، ابن سعود کے زمانہ میں حجاز میں جو مسائل اٹھے اس سلسلہ میں وفد خلافت کے سربراہ ہوکر حجاز بھی گئے، ان سب کی تفصیل حیات سلیمان میں ملے گی، جو شاہ صاحب نے مرتب کی ہے، ان سیاسی سرگرمیوں کو مولانا مسعود علی کی تنظیمی صلاحیتوں سے بڑی مدد ملی، اعظم گڑھ میں جب کوئی سیاسی رہنما آجاتا تو اس کے شاندار جلسہ کا اہتمام وہی بڑے سلیقہ سے کرتے، پھر چندوں کی فراہمی میں ان کو غیر معمولی مہارت تھی، انھوں نے خلافت کی تحریک میں ضلع اعظم گڑھ سے ایک لاکھ روپیہ جمع کیے تھے،

پورے ہندوستان میں اتنی بڑی رقم چندے میں شاید کوئی اور جمع نہ کر سکا تھا، سید صاحبؒ اور مولانا مسعود علی ندوی کے اثرات اتنے بڑھ گئے تھے کہ اس زمانہ کے تمام قابل ذکر سیاسی رہنما دارالمصنفین ضرور آتے، ان میں گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، لال بہادر شاستری، تصدق احمد خاں شروانی، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، ان کی والدہ محترمہ بی اماں، مولانا آزاد سبحانی، چودھری خلیق الزماں، رفیع احمد قدوائی، مولانا عبد الماجد بدایونی، عبد المجید خواجہ اور ڈاکٹر سید محمود وغیرہ سب ہی تھے، یہ تمام حضرات دارالمصنفین آکر خوش ہوتے، اور یہاں کی علمی صحبتوں سے لطف اٹھاتے، مولانا ابو الکلام آزاد اپنی مصروفیتوں کی بنا پر یہاں نہ آسکے، حالانکہ انھوں نے دارالمصنفین کی تاسیس کے موقع پر اپنے ایک مکتوب میں سید صاحبؒ کو تحریر فرمایا تھا:

"دارالمصنفین کا پراسپکٹس پہونچا، آپ مجھے اس سلسلہ میں جو کچھ بنانا چاہیں منظور رہے، آنریری فیلو تو ایک عمدہ بات ہے، اگر اس میں کوئی جگہ قلی کی ہو جب بھی میں منظور کر لوں، بشرطیکہ کام ہو اور مجسمع صحیح و خالص ہو۔"

اس کی مجلس انتظامیہ کے پہلے صدر نواب عماد الملک تھے، جو بلگرام کے رہنے والے تھے، مگر اپنے زمانے میں اپنی غیر معمولی قابلیت اور سوجھ بوجھ کے لحاظ سے اتنے مشہور ہوئے کہ نظام حیدر آباد نے اپنے یہاں بلا کر ان کو ریاست کا مدار المہام یعنی وزیر اعظم بنایا، انھوں نے یہاں کی مجلس انتظامیہ کی صدارت قبول کی تو اس ادارہ کی عزت بڑھی، مگر ان کو بھی اس اعزاز کا اعتراف رہا، وہ اس ادارہ کو مختلف صورتوں سے حیدر آباد کی ریاست سے فائدے بھی پہونچاتے رہے، جب ان کی وفات ہوئی تو سید صاحبؒ نے بہت ہی رنج و غم سے معارف میں یہ لکھ کر نوحہ کیا:

"نواب محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبیر و سیاست کا ماتم کیا، مولانا نذیر احمد کے مرنے پر سحر نگاری اور بزم آرائی کا مرثیہ پڑھا، مولانا شبلی کی موت پر ہم نے علم کے فقدان پر نوحہ کیا، مولانا حالی کو رخصت کرتے ہوئے ہم نے سخن وری اور دقیقہ سنجی پر نالہ کیا، لیکن نواب عماد الملک کی رحلت پر ہم قوم کا ماتم کرتے ہیں



اور اولو العزمانہ اخلاق کی گم شدگی پر فریاد۔

یہ ہستی گراں مایہ جس نے ۲۶ رجنوری ۱۹۱۷ء میں الوداع کہا، ہمارے کارواں قافلہ کا آخری مسافر تھا، اس کے بعد وہ دور جو انقلاب ہند کے بعد شروع ہوا تھا، ختم ہوگیا، وہ دور جو انگریزی کالجوں کی کائنات نہیں بلکہ یونیورسٹی مدارس کا نتیجہ تھی، گذر گیا، وہ دور جو قدیم تعلیم اور قدیم اخلاق کے نمونوں کو پیش کرتا تھا منقطع ہوگیا، یعنی آیندہ ہماری قسمت کے مالک عربی مدارس کے تعلیم یافتہ نہ ہوں گے، بلکہ انگریزی درسگاہوں کے ہیٹ ہوں گے، اب شرق، مشرق کی قومیت پر حکومت نہیں کرے گا بلکہ مغرب اب لیڈری اور رہبری جمہور کے لیے جوش دل اور اخلاص عمل ضروری نہ ہوگا بلکہ صرف ایک کامیاب عہدہ اور ایک عمدہ سوٹ،

فیا ویلاہ علی فقید الاسلام ویا خیبتاہ للمسلمین۔

ان کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی صدر یار جنگ بہادر اس کی مجلس انتظامیہ کے صدر ہوئے، جو حیدر آباد کے وزیر امور مذہبی تھے، وہ ادیب بھی تھے، شاعر بھی، عالم بھی، رئیس بھی، حسن، جمال، وقار، متانت اور سنجیدگی کے پیکر بھی تھے، اس لیے ان کی صدارت دارالمصنفین کی انگوٹھی میں نگینہ کی طرح جڑ گئی، دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے ساتھ ایک مجلس عاملہ بھی ہے، مجلس عاملہ کے پہلے صدر مولانا حمید الدین فراہیؒ ہوئے، جو علم تفسیر میں پورے ہندوستان میں کیا، بلکہ شاید تمام اسلامی ممالک میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے تھے، وہ مولانا شبلیؒ کے ماموں زاد بھائی تھے، ان کی وجہ سے بھی دارالمصنفین کا علمی وقار بڑھتا رہا۔

ان کے بعد مولانا عبد الماجد دریابادی مجلس ارکان کے صدر ہوتے رہے، وہ مستند عالم تو نہیں لیکن علماء کی صف میں ان کا نمایاں مقام تھا، پھر شعر و ادب کے میدان کے تو یکہ تاز رہے تو مفسر قرآن بھی ہوئے، فلسفۂ جذبات، فلسفۂ اجتماع، مکالمات برکلے، اسلام اور تصوف، محمد علی کی ذاتی ڈائری، حکیم الامت، سفر حجاز، بشریت انبیاء، قرآنی سیرت وغیرہ کے مصنف بھی ہیں۔

۳۳ء تک دار المصنفین کا دور ہر لحاظ سے زریں بن چکا تھا، میں پہلی دفعہ یہاں حاضر ہوا تو اس کے میرا متاثر ہونا لازمی تھا، اسی پُرکیف اور باوقار ماحول میں شاہ صاحب کی علمی زندگی پروان چڑھ رہی تھی۔

**خمستان پر شاہ صاحب کا ایک تبصرہ**

فروری ۱۹۳۴ء کے معارف میں شاہ صاحب کا ایک تبصرہ پنجاب کے مشہور شاعر جناب اثر صہبائی کے مجموعۂ کلام خمستان پر شایع ہوا، اس زمانہ میں جناب اثر صہبائی ایک تئیس برس کے جوان شاعر تھے، لیکن ادبی حلقوں میں امتیازی حیثیت حاصل کرلی تھی، ان کا یہ مجموعۂ کلام دو سو چھہتر (۲۷۶) صفحے پر مشتمل تھا، اس کے پانچ حصوں کے نام خود انھوں نے یہ رکھے تھے: تخیلاتِ بہمن زار، جامِ صہبائی، راحت کدہ اور ستارے، پہلے میں غزلیں تھیں، دوسرے میں مختلف کیفیات، جذبات اور مناظر وغیرہ پر مسلسل نظمیں تھیں، تیسرے میں وہ تاثرات تھے جو شاعر کے دل سے اپنی مرحومہ رفیقۂ حیات کے غم والم میں نالے بن کر نکلے تھے، چوتھے میں رباعیات اور پانچویں میں متفرق اشعار تھے، اس مجموعہ کے شروع میں حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مشہور شاعر جناب پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کی تعریفی تحریریں بھی تھیں، حضرت سید صاحبؒ نے اپنے تبصرہ کا عنوان 'جرعۂ مے' رکھا تھا، مگر جب اپنی اس تحریر کو اپنے مجموعۂ مضامین نقوشِ سلیمانی میں شایع کیا تو اس کی سُرخی خمستان ہی رکھی، اس کی ابتداء جس طرح کی اس کو ہم یہاں پر اس خیال سے نقل کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے ناظرین کو یہ بھی معلوم ہو کہ شاہ صاحب جس ادبی فضا میں زندگی گذار رہے تھے اس کا کیا رنگ تھا اور اس سے ان کا متاثر ہونا ناگزیر تھا، ان میں فطری صلاحیت پہلے سے موجود تھی، حضرت سید صاحبؒ کی شاگردی میں یہ دبی ہوئی صلاحیت برابر ابھرتی رہی، تو سید صاحبؒ خمستان کے مقدمہ میں اثر صہبائی کا تعارف اس طرح کراتے ہیں:

"کشمیر کے دستِ فیض نے نہ صرف خطۂ کشمیر کو رشکِ گلزار بنایا ہے، بلکہ جہاں جہاں بہار و خزاں کے انقلابات نے اس کی شاخوں اور ڈالیوں کو اڑا کر پہونچا دیا ہر جگہ ایک نیا چمن لگا دیا اور نیا گلشن کھلا دیا، پنجاب کی ہمسایہ زمین قدرۃً اس کا حق زیادہ رکھتی تھی اس لیے دہیں کے سرسبز و شاداب قطعوں نے سب سے زیادہ ان خانہ برانداز انِ چمن کو اپنی آغوش میں لے کر ان کی آبیاری کی اور پورے پنجاب کو اپنی نکہت بیزیوں سے گلکدہ بنا دیا، پنجاب میں سیالکوٹ کشمیر سے قریب تر ہے اور یوں بھی علم و ادب اور فضل و کمال کا ہمیشہ سے گہوارہ ہے، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی جن کو دو دفعہ شاہجہاں کی قدردانیوں نے چاندی میں تلوا دیا اور ہند سے لے کر روم تک ان کی تصنیفات نے اپنا سکہ بٹھا دیا، وہ اسی خوش سواد شہر کی خاک سے اٹھے تھے اور اس عصرِ جدید میں اقبال سا فلسفی اور شاعر پیدا کرنے پر اس کو بجا طور سے فخر و ناز ہے، اور یہ مرغِ خوش خوان بھی اسی ملک جنت نظیر کے باغوں سے اڑ کر یہاں تک پہونچا ہے، اس خمستان کا ساقی بھی اسی میکدہ کا صہبائی ہے"۔



پھر صہبائی کی تعریف یہ کہہ کر بھی کرتے ہیں کہ ان کے نطری شاعر ہونے میں کلام نہیں، ان کا دل عشق و محبت سے لبریز اور نالہ و شیون سے معمور ہے، چند سال ہوئے کہ ان کی رفیقۂ حیات نے ان کو دائمی الوداع کہا، اس حادثہ نے ان کو اور نازک دل شاعر بنا دیا ہے، جہاں ذرا ٹھیس لگی اور بلبلا اٹھے، اسی لیے ان کی شاعری میں سرور و شادمانی نہیں، بلکہ حزن و ملال ہے، اور اس پر مزید یہ کہ ان کے غم و افسوس کی آنکھوں میں آنسو نہیں، بلکہ صبر و سکون اور تسلی و تعزیت کے غمگین فلسفیانہ اشارات ہیں، ان کی غزلوں میں محبت کے اثرات اور عشق کے جذبات کے بجائے عشق و محبت کے حکیمانہ رموز و اسرار فاش ہوتے ہیں۔

ان کی مزید تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ بچپن سے شعر کہتے ہیں، اور اپنے ہموطن شاعر اقبال کے کلام کو ہمیشہ غور سے پڑھتے رہے ہیں، خیام و حافظ کا کلام بھی ان کے مطالعہ میں رہا ہے، میر و غالب کی زبان اور طرزِ بیان سے بھی متاثر ہوئے، میری رائے میں صہبائی میں استاد شاعر ہونے کے بجائے حکیم شاعر ہونے کی صلاحیت زیادہ موجود ہے، ان کے الفاظ میں شیرینی اور ترکیبوں میں فارسیت کی پوری چاشنی اور ساتھ ہی ان کے خیالات کے بازوؤں میں معانی بلند تک پرواز کی

پوری قوت۔ ان کے تخیل کے پردہ میں فلسفہ کی حقیقت ہمیشہ مستور رہتی ہے، یہی سبب ہے کہ ان کی غزلوں سے ان کی رباعیوں اور قطعات زیادہ باکیف، زیادہ پُرمغز اور زیادہ موثر ہیں۔

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ رباعی گوئی کے لیے ضرورت ہے کہ زبان صاف اور شیریں ہو، ترکیبیں چست ہوں اور رواں ہوں، اور پہلے مصرع سے بتدریج ترقی کر کے چوتھے مصرع میں پورا زور نمایاں ہو، یہ تو لفظی خوبیاں ہیں، معنوی خوبی یہ ہے کہ اس میں بلند حقایق اور معانی ادا ہوں، صہبائی کی رباعیات میں یہ خوبیاں موجود ہیں۔

سید صاحبؒ یہ بھی لکھتے ہیں کہ صہبائی کہیں کہیں خوب کہہ جاتے ہیں، لیکن ان کے بعض اشعار ایسے ہیں جو گو فصیح ہیں مگر ذرا سی الٹ پھیر سے فصیح تر ہو سکتے ہیں، مثلاً صہبائی کا ایک مصرع یہ ہے

ع گھنگھور گھٹائیں آئی ہیں، رحمت بن بن کر چھائی ہیں

سید صاحبؒ اس میں خفیف سی ترمیم اس طرح چاہتے ہیں:

ع گھنگھور گھٹائیں آئی ہیں اور رحمت بن کر چھائی ہیں

صہبائی کا ایک حسب ذیل مصرعہ تھا:

ع کعبہ میں بت خانے میں یہ بات کہاں میخانے کی

سید صاحبؒ اس میں بھی خفیف سی ترمیم کے خواہاں ہوئے:

ع کعبہ اور بت خانے میں یہ بات کہاں میخانے کی

صہبائی کا ایک شعر یہ ہے ؎

یوں داد وفا کی ہوتی ہے، یوں مرنے والے مرتے ہیں
اک داغ سی شمعِ کشتہ ہے، خاکستر سا پروانہ ہے

صہبائی کا ایک اور شعر یہ ہے ؎



برسات کی چاندنی راتوں میں دیکھے تو کوئی صہبائی کو
لب پہ ہیں مناجاتیں لاکھوں، ہاتھوں میں بھی پیمانہ ہے

سید صاحبؒ نے اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں یہ تغیر کرنا پسند کیا:

لب پہ ہیں مناجاتیں لاکھوں اور ہاتھوں میں پیمانہ ہے

سید صاحبؒ نے صہبائی صاحب کو یہ بزرگانہ مشورہ بھی دیا کہ وہ اپنے کلام کی اشاعت میں اس وقت تک تاخیر کریں جب تک اس کی صحت کا ہر طرح یقین نہ ہو، شراب جس قدر پرانی ہوتی ہے اتنی ہی پرجوش اور باکیف ہوتی ہے۔

یہ مجموعہ معارف میں ریویو کے لیے آیا تو سید صاحبؒ نے شاہ صاحبؒ کے ادبی ذوق کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان ہی کو اس پر ریویو لکھنے کو فرمایا، وہ جو کچھ لکھ چکے تھے اس سے زیادہ شاہ صاحب کیلیے لکھنے کی گنجایش نہ تھی لیکن وہی ساری باتیں اپنے انداز میں کہیں، پہلے تو ان کے کلام کی تعریف یہ لکھ کر کی:

"جناب اثمہ اپنے اکثر معاصر شعراء کی طرح محض قافیہ پیما نہیں، بلکہ فطری شاعر ہیں، جس کی جھلک ان کے کلام کی ہر صنف میں نظر آتی ہے، لیکن میرے خیال میں وہ غزل گوئی کے بہ نسبت رباعی گوئی میں زیادہ کامیاب ہیں، اگر وہ اپنی شاعری کو رباعی گوئی تک جو اور اصناف سخن سے زیادہ مشکل ہے، محدود کر دیتے تو زیادہ کامیاب شاعر ہوتے، ان کی بیشتر رباعیاں نہایت خوب ہیں، ان میں خیام کی طرح رندانہ اور حکیمانہ ہر قسم کے خیالات ہیں۔"

ان کی غزل گوئی کے بارہ میں یہ لکھا:

"تغزل میں جہاں تک خیالات کا تعلق ہے، ان کی شاعری نہایت پرکیف ہے اور ان کے سرو تغزل میں سوز و گداز، معرفت و حقیقت، شوخی و رنگینی، رندی و سرمستی اور اخلاق و حکمت

وغیرہ ہر قسم کے نغمے موجود ہیں"۔

اس کے بعد اپنے فاضل استاذ کی تقلید میں ان کی شاعری سے متعلق اپنے ادبی ذوق کی بنا پر مفید مشورے بھی دیے، لکھتے ہیں:

"جہاں تک خیالات کا تعلق ہے، جناب اثر کی شاعری نہایت کامیاب ہے، لیکن ابھی کلام میں پوری مشق اور پختگی نہیں ہے، اسی لیے وہ الفاظ اور طرز ادا کو خیالات کا ہم آہنگ نہیں بنا سکتے، اور طرز ادا اور زبان کی خامیاں جا بجا نظر آتی ہیں"۔

ان خامیوں کی نشاندہی اپنے استاذ ہی کی طرح کی، لیکن انداز ان کا اپنا تھا، اثر صاحب کا ایک مصرعہ یہ تھا:

بجلیاں تھیں بھری ہوئی زمزمۂ رباب میں

شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وزن کے لحاظ سے بجلیاں کا تلفظ صحیح نہیں ادا ہوتا، اگر اسے "برق تھی کون سی بھری" سے بدل دیا جائے تو یہ نقص دور ہو جائے گا۔

ان کے اس مصرعہ پر

سو سو تبسمات ہیں ان کی نگاہ میں

شاہ صاحب یہ توجہ دلاتے ہیں کہ اردو میں تبسمات الف ت کے ساتھ جمع غیر مستعمل یا کم از کم غیر فصیح ہے، تبسم ہی جمع اور کثرت دونوں مواقع پر استعمال ہوتا ہے۔

ایک مصرعہ یہ بھی تھا:

ٹوٹ کر دل میں رہ گئے آنسو

شاہ صاحبؒ نے لکھا کہ آنسوؤں کا ٹوٹ کر دل میں رہ جانا کوئی محاورہ نہیں۔

ایک اور مصرعہ یہ تھا:



فضائیں عاشقی کی جھومتی ہیں

شاہ صاحبؒ نے اس پر یہ رائے دی کہ اولاً عاشقی کی فضاؤں کا جھومنا خود قابل غور ہے، اور اگر اس مفہوم کو صحیح بھی مان لیا جائے تو جھومنے کے بجائے "وجد میں ہیں" ہونا چاہیے۔

اثر صاحب کے حسب ذیل دو شعروں پر بھی شاہ صاحبؒ کی نظر گئی۔

یہ دل اک داغ ہے کتنا طلسم انگیز ہے لیکن — کبھی صحن گلستاں ہے کبھی صحرائے ویراں ہے

کبھی اے شیخ رندوں کی کرامت تو نے دیکھی ہے — اٹھے دست دعا اور جھوم کر ابر بہار آئے

شاہ صاحب کا خیال ہوا کہ ان اشعار میں تھوڑی سی تبدیلی اور تقدیم و تاخیر سے بندش زیادہ چست اور فصیح ہو سکتی ہے، اور شاعر کے خیال میں زیادہ زور پیدا ہو سکتا ہے، اس لیے پہلے شعر کے پہلے مصرع میں یہ ترمیم کی:

یہ دل گو داغ ہے لیکن طلسم انگیز ہے کتنا

اور دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں یہ تبدیلی چاہی:

ادھر دست دعا اٹھے ادھر ابر بہار آئے

اثر صاحب کا ایک مصرع یہ بھی تھا:

جو ناداں ہر بلا کو اک بلائے آسماں سمجھے

شاہ صاحبؒ نے اس میں یہ تبدیلی کی:

جو ناداں ہر مصیبت کو بلائے آسماں سمجھے

اور لکھا کہ اک کا حشو بھی حذف ہو جاتا ہے اور بلا کی بے ضرورت تکرار کا نقص بھی جاتا رہتا ہے۔

اثر صاحب کے ان دو اشعار پر بھی ان کی نظر گئی۔

غوطہ زن بحر عقیدت میں ہے دربان تیرا — ڈھونڈنے آیا ہے یاں سایۂ داماں تیرا

صبح خنداں ہے، موسم گل ہے　　　نغمہ زن اپنی لے میں بلبل ہے

شاہ صاحبؒ اپنے ذوق سے ان اشعار کی بندش کو زیادہ چست اور فصیح بنانے کے خیال سے پہلے اور دوسرے شعر کے آخری مصرعوں میں یہ تبدیلی چاہتے ہیں:

ع ڈھونڈنے در پہ تیرے آیا ہے داماں تیرا

ع نغمہ پیرا چمن میں بلبل ہے

شاہ صاحبؒ کو شاعری میں صحت زبان، انتخاب الفاظ اور بلاغت ادا کا بڑا خیال رہتا، اور ان کی دلیل یہ تھی کہ گو حسن ہر لباس میں حسن ہے، لیکن ظاہری لباس کی خوبی حسن کو اور دوبالا کر دیتی ہے، ہمارے خیال میں کوئی صاحبِ مذاق حسن کو گدڑی میں دیکھنا اور شرابِ انگور کو بلوریں ساغر کے بجائے جامِ سفال میں پینا پسند نہ کرے گا،

ان کی اس مختصر سی تقریظ سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ ان کو اپنے استاد کی شاگردی میں ان کے ذوق کی جلا کس طرح ہو رہی تھی۔

**مستشرقین پر شاہ صاحبؒ کے خیالات**

اسی زمانہ میں ہندوستان اور مصر میں یہ بحث چل رہی تھی کہ مستشرقین کی علمی سرگرمیوں سے مسلمانوں کو فائدہ پہونچ رہا ہے یا نقصان، ایک گروہ کہتا کہ ان کی زہر چکانیوں سے شدید نقصان پہونچا اور پہونچ رہا ہے، دوسرا گروہ ان کی علمی سرگرمیوں سے مرعوب تھا، وہ کہتا کہ ان سے نقصان کم، فائدہ زیادہ پہونچا، مصر میں ان متضاد خیالات پر دو[2] اہم مضامین نکلے، ایک تو ڈاکٹر حسین ہرادی اور ایک ڈاکٹر ذکی مبارک کا تھا، اول الذکر نے ان لوگوں کی ترجمانی کی جو اس خیال کے تھے کہ مستشرقین کی ساری سرگرمیاں مسلمانوں کے لیے سراسر مضر ثابت ہو رہی ہیں، ان کے دلائل یہ تھے:

ان مستشرقین کے مباحث میں بہت سی خلاف عقل و قیاس باتیں نظر آتی ہیں خصوصاً جو مذہب اسلام پر ہیں ان میں اسلام کی ایسی عجیب و غریب تصویر پیش کی جاتی ہے جسے کوئی مسلمان برداشت نہیں کر سکتا،



مثلاً مارشل اپنی کتاب شادی میں لکھتا ہے کہ مصر میں اسلامی پردہ کا یہ اثر ہے کہ وہاں چودہ[14] سال کی عمر کے بعد ماں بھی اپنی لڑکی کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی، مگر اسی کتاب میں ایک دوسرے موقع پر یہ بھی ہے کہ مصری لڑکی اپنے چہرے کے علاوہ باقی جسم کے تمام حصوں کو مردوں کے سامنے عریاں کر سکتی ہے، اسی کتاب میں یہ بھی ہے کہ نعوذ باللہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) محض ایک زن پرست آدمی تھے، یہ مستشرقین مسلمانوں کے کسی ملک کی قدیم یا جدید تاریخ لکھتے ہیں تو محقق بن جاتے ہیں لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر قلم اٹھاتے ہیں تو وہ نہایت لغو، مہمل، ذلیل، رکیک بلکہ جھوٹ باتیں لکھ جاتے ہیں، مثلاً ایک مستشرق کا خیال ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نعوذ باللہ ایک جنگی مذہب کے بانی تھے جس کو انسانی فضائل سے کوئی تعلق نہیں، مشہور پروفیسر مارگولیتھ نے اپنی کتاب "تاریخ العالم" میں یہ نادر تحقیق پیش کی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) عبداللہ کے بیٹے ہیں، اور عبداللہ عرب میں اس لڑکے کو کہا جاتا تھا جس کا باپ لامعلوم ہو، بہت ممکن ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے باپ کا نام عبداللہ بھی اسی وجہ سے پڑا ہو، اسی طرح انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نہایت دل شکن اور تکلیف دہ باتیں درج ہیں، لجنۃ العمل المغربی اسلام کے متعلق خرافات کا ایک زہر چکاں مجموعہ ہے، اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ شمالی افریقہ اور دوسرے اسلامی ملکوں میں جہاں کی مادری زبان عربی ہے، عربی کی اہمیت گھٹا کر وہاں کے باشندوں کو مقامی زبانوں کے زندہ کرنے کے دام میں پھنسایا جائے تاکہ وہ عربی زبان کو بھول کر قرآن کو نہ سمجھ سکیں، یورپ کی یونیورسٹیوں میں طلبہ کو مشرقی زبانوں کی تعلیم اس لیے دی جاتی ہے کہ وہ استعماری مشن اچھی طرح چلائیں، انہی میں سے کچھ مستشرقین بن جاتے ہیں جن کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ پہلے وہ اپنے ذہن میں ایک نظریہ یا ایک خیال فرض کر لیتے ہیں، اس کے بعد اس کے اسباب تلاش کرتے ہیں، اگر قرآن میں ان کو کوئی ایسی شے مل جاتی ہے جو ان کے مفید مطلب ہے یا اسے کھینچ تان کر اپنے مقصد کے مطابق بنا سکتے ہیں تو فوراً اسے لے لیتے ہیں اور اگر قرآن ان کے

مقصد کو پورا نہیں کرتا تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ قرآن میں ہے ہی نہیں، مثلاً انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے چیف ایڈیٹر موسیو ونسنک نے اپنی غیر معمولی تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن کی مکی سورتوں میں کہیں یہ ذکر نہیں کہ ابراہیمؑ کعبہ کے معمار یا پہلے مسلمان تھے، ان میں ابراہیمؑ کی حیثیت محض ایک رسول کی ہے جو دوسرے انبیاءؑ کی طرح اپنی قوم کو ڈرانے کے لیے مبعوث ہوئے تھے، ان سورتوں میں اسمٰعیلؑ کے ساتھ ابراہیمؑ کے کسی تعلق کا بھی ذکر نہیں، موسیو ونسنک لکھتا ہے کہ مدنی سورتوں میں یہ حالت بدل جاتی ہے، ابراہیمؑ حنیف مسلم اور ملت ابراہیمی کے بانی بتا دیے جاتے ہیں، جنھوں نے اسماعیلؑ کے ساتھ خانہ کعبہ کو بنایا؛ ان مفروضات سے یہ نتیجہ نکال کر گمراہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مکہ میں یہودیوں پر اعتماد کیا، لیکن جب وہ ان کے دشمن ہو گئے تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی ذکاوت اور عقل سلیم سے ابوالعرب ابراہیمؑ کی ایک نئی شان پیدا کر دی، اس طرح اس زمانہ کی یہودیت سے گلو خلاصی حاصل کر کے ابراہیمؑ کی یہودیت سے جو اسلام کا منبع اور مولد ہے رشتہ جوڑنا آسان ہو گیا، اور جب مکہ والوں نے ان کے پیغمبرانہ خیالات کو قبول کرنا شروع کر دیا تو اس وقت ابراہیمؑ اس مقدس شہر کے مقدس گھر کے بانی ہو گئے، ونسنک نے اپنی اس تحقیق میں بظاہر قرآن کی ایک ایک آیت کو پڑھ کر یہ رائے قائم کی ہے، لیکن اس کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، اس نے اپنی اس تحقیق میں انتہائی خیانت اور بد دیانتی سے کام لیا ہے، اور اس کذب صریح سے اس کا مقصد صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تکذیب ہے، وہ نہایت بے باکی سے دعویٰ کرتا ہے کہ مکی سورتوں میں ابراہیمؑ کا ذکر معمار کعبہ کی حیثیت اور اسماعیلؑ کے ساتھ ان کے کسی تعلق کا ذکر نہیں ہے، اور مدنی سورتوں سے ملت ابراہیم کا ذکر شروع ہوتا ہے، لیکن یہ تینوں دعوے سراسر جھوٹ ہیں، سورۂ ابراہیم خود مکی ہے، جس میں نہایت واضح طور پر کعبہ اور ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے تعلق کا تذکرہ موجود ہے، ابراہیم رکوع ۶ میں حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے ہے: "خدا کا شکر ہے جس نے مجھ کو بڑھاپے میں اسمٰعیل



اور اسحٰق دیے، میرا رب دعا کا سننے والا ہے"! سورۂ انعام بھی مکی سورہ ہے، اس کے رکوع ۲۰ میں ملت ابراہیمی کا ذکر اس طرح ہے کہ وہی ٹھیک دین ہے جو ابراہیم کا دین ہے، جو ایک خدا کے ہو رہے تھے، اور مشرکین میں نہ تھے، اور پھر سورۂ نحل کی مکی سورہ میں ہے کہ "ہم نے تمھاری طرف وحی بھیجی کہ ملت ابراہیم کی پیروی کرو، جو ایک خدا کے ہو رہے تھے اور مشرکین میں نہ تھے (انعام ع ۲۰)

ان صریح آیات کے بعد ونسنک نے جو کچھ لکھا ہے، وہ سراسر بد دیانتی اور خیانت ہی پر مبنی ہے، یہ مستشرقین اسلام یعنی ملت ابراہیمی کو یہودیت سے ماخوذ بتاتے ہیں جو یہوداہ کی جانب منسوب ہے لیکن یہوداہ ایک شخص تھا جو حضرت ابراہیمؑ سے سینکڑوں برس بعد ہوا ہے، پھر ظاہر ہے کہ ملت ابراہیمی یہودیت سے کیسے ماخوذ ہو سکتی ہے، مستشرقین کے اس قسم کے خرافات اور غلط بیانات کی داد لوگوں سے ملتی ہے۔

یہ تو ان لوگوں کی ترجمانی ہوئی جو مستشرقین سے بدظن ہیں، اب ان لوگوں کے خیالات بھی سامنے آجائیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ مستشرقین سے نقصان سے زیادہ فائدہ پہونچتا ہے، اس کی ترجمانی مصر کے ڈاکٹر زکی مبارک نے کی ہے،

وہ لکھتے ہیں کہ اعتراض یہ ہے کہ مستشرقین مستعمرین کی فوج کا طلیعہ ہیں، اگر بالفرض وہ یہی ہیں تو یہ طریقہ صحیح نہیں کہ ہم ان مستعمرین کے دشمن بن جائیں، اور ان سے ہر طرح کے تعلقات منقطع کر لیں، اس کے بجائے ہم کو ان کے استعمار کے تدارک کے لیے ان کے علوم و فنون اور ان کے اسرار کا پتہ لگانا چاہیے، اور جس طرح وہ ہم پر وار کرتے ہیں ہم بھی ان پر وار کریں، یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ سارے مستشرقین دام استعمار کے حلقہ میں ہیں، بعض ایسے مستشرقین بھی ہیں جو صحیح معنوں میں عالم کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں، ان میں اگر استعمار کا جذبہ ہوتا بھی ہے تو ان کے علمی ذوق کی وجہ سے دب جاتا ہے اور وہ مشرق کے شرف و عظمت کے بڑے نقیب اور اس کی تہذیب و معاشرت بلکہ اس کے مذہب کے

بڑے حامی بن جاتے ہیں، مثلاً بہت سے مستشرقین بصریوں اور کوفیوں کے صرفی و نحوی درس میں مشغول رہے ہیں، مصادر کے جمع اور ان کے نصوص و شواہد اور علمائے فن کے فیصلوں کی طبع و اشاعت میں برسوں گذار دیے ہیں، مختلف قبائل کی بولیوں اور ان کے لہجوں کے اختلاف کی تحقیق میں مدتیں صرف کی ہیں، بعض مستشرقین غلطیاں ضرور کرتے ہیں جو عموماً کسی متن کی شرح کے سلسلہ میں ہوتی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عربی زبان کی باریکیوں اور اداؤں سے ناواقف ہوتے ہیں، ایسی غلطیاں موسیو ڈوزی نے نفح الطیب اور مارگولیتھ نے معجم الادباء کی تصحیح میں ضرور کی ہیں، لیکن ان دونوں نے ان دو اہم کتابوں کو شایع کرکے عربی زبان کی بڑی خدمت انجام دی ہے، یہ صحیح ہے کہ بہت سے مستشرقین اسلام کے متعلق ایسے خرافات لکھتے ہیں کہ کسی طرح علماء اور محققین کے شایان شان نہیں لیکن ان اعتراضات سے بعض مذہبی پہلوؤں کی خدمت بھی ہو جاتی ہے، انھوں نے اپنی اسلام دشمنی کے باوجود قرآن اور حدیث کے متعلقات پر نہایت عمدہ تالیفیں طبع کیں، ان کی فہرستیں بنائیں، ان کی بہتر سے بہتر ترتیب اور تبویب کی، موسیو ونسنک پر چاہے جتنے اعتراضات کیے جائیں اس نے حدیث نبویؐ پر اپنی تالیف سے اسلام کی بڑی خدمت انجام دی ہے، یہ صحیح ہے کہ اس کتاب کی اشاعت میں حسن نیت شامل نہ تھا، پھر بھی غیر ارادی طریقہ سے اسلام کی خدمت ہو گئی، امریکہ اور یورپ میں آثار اسلامیہ کی اشاعت پر جتنا کام ہو رہا ہے، مسلمانوں کے ملکوں میں نہیں ہو رہا، ان کی زندگی ان پر بحث و تنقید ہی میں ہے، مسلمان مخالف تنقید نگاروں کے شر سے خیر کے لیے استفادہ کر سکتے ہیں، اس بات کو کوئی کیسے نظر انداز کر سکتا ہے کہ مستشرقین نے ہم سے تین صدی پہلے اسلامیات کا مطالعہ کرنا شروع کیا، جس سے ان کی علمی تحقیقات ہر شعبہ میں پھیلی ہوئی ہیں، کس قدر شرم کی بات ہے کہ جامع ازہر کے اساتذہ کو چند برسوں پہلے تک اسلامی تاریخ پڑھانے کا ڈھنگ نہیں معلوم تھا، جامع ازہر کے ادبی کالج میں عربی زبان کے طلبہ کی تعداد



اتنی نہیں ہے جتنی سار بن یونیورسٹی میں ہے، پیرس کی السنۂ مشرقیہ کی درسگاہ میں عربی کے اتنے مطبوعہ ماٰخذ ہیں کہ مصری دار الکتب میں ان کا نام بھی نہیں، یہ ضرور ہے کہ مستشرقین کے سامنے ان کے اپنے اغراض و مقاصد ہوتے ہیں، لیکن کون کہتا ہے کہ بے سمجھے بوجھے ان کی پیروی کی جائے، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی کوششوں سے لغوی اور اسلامی درس میں زندگی پیدا ہوئی، دنیا میں کوئی چیز خالص خیر اور خالص شر نہیں ہوتی، لیکن مستشرقین کے کاموں میں نفع کا پہلو غالب ہے۔

شاہ صاحبؒ نے حضرت سید صاحبؒ کی فرمایش پر مصر کے دونوں مذکورۂ بالا فضلاء کے مضامین کی تلخیص کی، جو اپریل ۱۹۳۴ء کے معارف میں شایع ہوئی، اس کے شروع میں انھوں نے جو محاکمانہ رائے لکھی ہے، وہ ان دونوں مضامین سے کم نہیں، بلکہ بعض حیثیت سے ان سے اہم ہے، وہ لکھتے ہیں:

"اس سیاسی دور میں جب کہ ہر کام اور ہر عمل کی تہہ میں کوئی نہ کوئی غرض پنہاں ہوتی ہے، مشرقیات اور اسلامیات کے متعلق مستشرقین کی تحقیقات کے قبول کرنے کا سوال نہایت اہم ہے، اس میں شبہہ نہیں کہ بہت سے مستشرقین نے مسلمانوں کی بڑی خدمت کی، انھوں نے ساری ساری عمریں اسلامیات کی تحقیق میں صرف کر دیں، اور بڑی جانکاہ محنت اور روحانی و مالی قربانی برداشت کرکے مسلمانوں کے علوم و فنون اور ان کی گذشتہ عظمت کو دنیا کے سامنے پیش کیا، ان کی نادر اور نایاب کتابوں کا پتہ چلایا، اور بڑی مشقت اور بڑے اخراجات برداشت کرکے انھیں حاصل کیا، اور نہایت اہتمام اور صحت کے ساتھ شایع کیا، ان پر حواشی لکھے، ان کی شرحیں کیں، مختلف زبانوں میں ان کے تراجم شایع کیے، اسلامی موضوع پر نہایت بلند پایہ کتابیں تالیف کیں اور اسلامی علوم و فنون کی ہر شاخ پر نہایت وسیع لٹریچر فراہم کر دیا جو مسلمانوں کے لیے ممکن نہ تھا،

ان کی ان اسلامی خدمات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، ان کی محنت و جانفشانی کی داد نہ دینا ظلم اور احسان فراموشی ہے، لیکن اسی کے ساتھ جہاں اسلام کے متعلق ان کے افکار، خیالات اور تحقیقات کا تعلق ہے، خالص اسلامی نقطۂ نظر سے ان کے قبول کرنے کا سوال نہایت اہم ہے، اس لیے کہ اسلامی مسائل کے متعلق اپنی تحقیقات میں انھوں نے اب تک نیک نیتی کا کوئی ثبوت نہیں دیا ہے، یا تو وہ مشرقی روایات، مشرقی مذاق اور اسلامی ذوق و نظر سے بیگانہ ہونے کی وجہ سے اسلامیات کے سمجھنے اور اس کے پیش کرنے میں نہایت فاش غلطیاں کرتے ہیں، یا عمداً وہ اسلام کو نہایت مسخ شدہ صورت میں پیش کرتے ہیں، بہرحال جو صورت بھی ہو، ان کی یہ غلطیاں علم و فن کی خدمت اور تحقیق اور ریسرچ کے پردہ میں ہوتی ہیں، یہ زمانہ تحقیق اور ریسرچ کا ہے اس لیے ان سے مسلمانوں اور غیر قوموں میں اسلام کے متعلق سخت گمراہیاں پھیلتی ہیں، بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کو یونانی فلسفہ، عجمی دہریت اور ہندی خرافات، کسی سے اتنا نقصان نہیں پہونچا جتنا ان محققین کی زہر آلود تحریروں سے پہونچتا ہے، جس کے مظاہر آئے دن آج کل کے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں میں نظر آتے ہیں، اس لیے مذہب اسلام کے متعلق ان کی تحقیقات پر اعتماد کرنا سخت غلطی ہے۔"

شاہ صاحبؒ نے یہ ساری باتیں اب سے تقریباً پچاس سال پہلے لکھی تھیں لیکن اس وقت سے اب تک بہت سے اور ایسے مستشرقین پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں جو اپنی مناظرانہ تحریروں، مجادلانہ استدلالوں، گمراہ کن منطقیانہ مغالطوں، پھر تحریفات، تلبیسات، دور از کار قیاسات اور احتمالات سے معلومات کا سلسلہ پیدا کر کے اپنے تعصب کی چنگاریوں سے مستند معلومات اور واقعات کو جلانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، ٹامس کارلائل نے اپنے زمانہ کے ایسے مصنفین کے بارے میں لکھا تھا کہ ان کی تحریریں قطعاً ہماری روسیاہی کا باعث ہیں، مگر اپنی روسیاہی کا خیال کیے بغیر وہ کذب و افترا سے



بھری ہوئی ایسی اشتعال انگیز تحریریں لکھنے کے عادی ہو گئے ہیں کہ ان کے لیے جہاد بالقلم کے بجائے جہاد بالسیف کا حکم جاری ہو تو کوئی تعجب کی بات نہ ہونی چاہیے، لیکن یہ بھی ملحوظ رہے کہ ان کی ایسی تحریریں ان کے احساسِ کمتری کا بھی نتیجہ ہیں، وہ اپنی عیسائیت کی فرسودگی اور کہنگی سے روز بروز کچھ ایسے مایوس ہوتے چلے جاتے ہیں کہ اسلام اپنی جاندار تعلیمات کی وجہ سے ان کے جسم میں کانٹے کی طرح چبھتا ہے، ان کو غیر شعوری طور پر احساس ہے کہ اسلام میں توحید، رسالت، ایمان پروری اور اخلاق کی اعلیٰ تعلیمات ہیں، وہ پھیلتی رہیں تو وصال مصطفویؐ افتراق بولہبی ہے اور کہیں یہ ایمان قسمت عالم کا کوکبِ تابندہ نہ بن جائے، اور اس کی تابانی سے افسون سحر شرمندہ نہ ہوتی رہے، ان کا ہر فرد اپنی زبان حال سے یہ کہتا نظر آتا ہے کہ

ع ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں

اس بیداری کو روکنے کے لیے جہاں یورپ کے ارباب سیاست نے اپنا سیاسی اور جنگی محاذ قائم کر رکھا ہے، وہاں مستشرقین نے اپنا علمی محاذ بھی کھول رکھا ہے، جس میں تحقیقات کے نام پر ان کا حیلۂ افرنگی اور ان کی عقل کی روباہی زیادہ کام کرتی ہے، ان کے جوابی حملہ کے لیے ضرورت تو اس کی ہے کہ ان کے مذہبی عقائد و افکار پر اسی طرح جارحانہ ہلہ بولا جائے، مگر ان کو ہم پر یہ برتری اس لحاظ سے حاصل ہے کہ وہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق جو چاہیں کہہ سکتے ہیں، مگر ہم ان کے پیغمبر علیہ السلام کے خلاف کچھ کہیں تو ہمارے ایمان اور اسلام کے اذعان میں خلل پڑتا ہے، اس کے علاوہ ان کی افترا پردازی کا آرٹ اور اس کے ابلاغ کے وسائل و ذرائع اتنے بڑھ چکے ہیں کہ ہم ان کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے، مگر ان کا مقابلہ موثر طریقہ پر اس طرح ہو سکتا ہے کہ پوری ملت اسلامیہ کو اپنے اس بلند ذہنی تخیل پر جس کو ہماری اصطلاح میں

ایمان کہا جاتا ہے غیر متزلزل یقین اور اذعان پیدا ہوجائے، وحدت ایمان اور وحدت عمل کی ناقابل شکست قوت ہم میں برابر پیدا ہوتی رہے تو غیروں اور مستشرقوں کی زہر چکانی اور اسلام دشمنی ہم کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتی، ہمارے لیے یہ بشارت ہے۔

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

(باقی)

---

# حیات سلیمان

"حیات سلیمان" بحمد اللہ چھپ کر شایع ہوگئی، یہ محض جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی محض سادہ سوانح عمری نہیں ہے بلکہ ان کے گوناگوں مذہبی، علمی، تعلیمی، قومی، ملی، سیاسی حالات، واقعات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے جس میں ان کے دور کی تمام ملی و قومی و سیاسی و علمی و ادبی و لسانی تحریکوں، مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، مسئلۂ ملوکیت حجاز، انہدام مقابر و آثار حجاز، واردھا اسکیم، تحریک جنگ آزادی وغیرہ کی بھی ضمناً تفصیل آگئی ہے، اسی کے ساتھ دار المصنفین کی تاسیس اور سال بسال اس کی ترقی کی روداد اور سید صاحب کا سفر بھوپال، ترک قیام دار المصنفین، ہجرت پاکستان، پھر بھوپال اور پاکستان کے چند سالہ قیام کے دوران ان کی علمی خدمات اور پھر خلافت کے مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے پہلے سفر یورپ پھر سفر حجاز، پھر سفر افغانستان وغیرہ کی بہت مفصل روداد بھی خود سید صاحبؒ کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہوگئی ہے، یہ کتاب ہر لحاظ سے بالکل "حیات شبلی" کا مثنیٰ ہے۔

مولفہ شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت: ۲۷ روپیے ۵۰ پیسے

"منیجر"



# کلامِ اقبال
میں
# رومی کی شعری تلمیحات و اقتباسات

از پروفیسر خواجہ عبد الحمید یزدانی گورنمنٹ کالج لاہور

(۲)

زبور عجم کے آخری حصے میں علامہ نے فنون لطیفۂ غلاماں سے بحث کی ہے، جس میں غلاموں کی موسیقی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس پر گویا موت کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں، اور یہ سوز و امید سے عاری اور ذوق فردا و لذت امروز سے خالی ہے، البتہ اس میں بیزاری کا پیغام اور مریضانہ غم کا احساس ضرور پوشیدہ ہے..... اس حصے میں حکیم الامتؒ نے رومی کے ان دو شعروں سے کام لیا ہے:

معنی آں باشد کہ بستاند ترا | بے نیاز از نقش گرداند ترا
معنی آں نبود کہ کور و کر کند | مرد را بر نقش عاشق تر کند

یہ اشعار مثنوی رومی کے دفتر دوم میں "فی المناجات" کے تحت آئے ہیں، اس میں مولانا نے خدائے بزرگ و برتر کے حضور نذرانۂ عجز پیش کرتے ہوئے گناہوں سے درگذر کرنے اور "سخنہائے رقیق" سکھانے کی التجا کی ہے، فرماتے ہیں کہ دعا اور اجابت، امن اور خوف سب تیری ہی طرف سے ہے، اس کے بعد اپنی خطاؤں کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ سے استدعا کی گئی ہے کہ وہی مصلح اور وہی سلطان سخن ہے پھر کائنات میں قدرت کی نقاشی و میناگری، آب و گل سے نقش آدمؑ کے سنوارنے اور اس کی مختلف نسبتوں خال و عم اور ان سے متعلق شادی و غم کا تذکرہ ہے، یہاں مولانا کہتے ہیں کہ کچھ ایسے بھی انسان ہیں جنھیں تو نے ان جھنجھٹوں سے آزاد رکھا ہے، وہ اپنے آپ سے بے خبر تمام محسوسات کو رد کرتے ہوئے ایک نادیدہ

معشوق کے عشق میں کھوئے ہوئے ہیں، دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی یہ دعا، جس کا آغاز شعر ذیل سے ہوتا ہے، کوئی بارہ[۱۲] اشعار پر مشتمل ہے:

اے خدائے پاک بے انباز و یار
دست گیر و جرم ما را درگذار

اس دعا، کے آخر میں لفظ "عشق" آگیا ہے، چنانچہ مولانا حسب عادت اب اس کلمہ کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں، اور اپنے مخاطب کو محسوس، ظاہری اور نظر آنے والی صورتوں کے عشق سے دور رہنے اور معشوق پنہانی کا عشق اختیار کرنے کی تلقین فرماتے ہیں، عشقِ صورت کو زوال ہے، جب جسم سے روح پرواز کر جاتی ہے تو صورت برقرار رہتے ہوئے بھی عاشق اس کی طرف مائل نہیں ہوتا، وفا کے سبب ایسے عشق میں کتنا ہی اضافہ کیوں نہ ہو جائے پھر بھی "صورت" میں وہ کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا، اپنے اس مطلب کی وضاحت کے لیے مولانا نے بڑی اچھوتی مثال دی ہے، سورج کی روشنی دیوار پر پڑتی ہے تو وہ بھی چمکنے لگتی ہے، لیکن اس کی یہ تابش عارضی و عارضی ہوتی ہے، "عشق صورت" گویا مٹی کے ڈھیلے سے دل لگانا ہے، لہٰذا "عشق اصل" کا طالب ہونا چاہیے کہ اسی کو بقا ہے، مولانا اسی طرح مختلف امثال سے عشق ظاہری و فانی کو ہدف تنقید بناتے ہوئے صاحبِ دل یا دوسرے لفظوں میں جمالِ حقیقی و باقی کا عاشق بننے کا درس دیتے اور کہتے ہیں کہ حسنِ معنیٰ کی طرف تو متوجہ ہے، وہ ظاہری اور فانی ہے، معنیٰ درحقیقت وہ ہے جو اپنی طرف متوجہ کر کے ظاہری نقش سے بے نیاز کر دے، وہ معنیٰ بھی کیا ہوا جس سے انسان کے حواس ہی بجا نہ رہیں، اور جو اسے عارضی و فانی حسن پر عاشق تر کر دے، مولانا کے نزدیک صورت ظاہری کا عاشق نابینا اور بہرا ہے:

اے کہ تو ہم عاشقی بر اصلِ خویش
خویش از صورت پرستان دیدہ بیش

پرتوِ عقل ست آں بر حسِّ تو
عاریت می داں ذہب بر مسِّ تو

چوں زر اندود ست خوبی در بشر
ورنہ چوں شد شاہد تو پیر خر



چوں فرشتہ بود ہمچوں دیو شد
کاں ملاحت اندرو عاریہ بد

اندک اندک می ستانند آں جمال
اندک اندک خشک می گردد نہال

رو نعمرہ ننکسہ[۱] بخواں
دل طلب کن دل منہ بر استخواں

کاں جمالِ دل جمالِ باقی است
دولتش از آبِ حیواں ساقی است

خود ہم او آب و ہم او ساقی و مست
ہر سہ یک شد چوں طلسم تو شکست

آں یکے را تو ندانی از قیاس
بندگی کن ژاژ کم خا ناشناس

معنیٔ تو صورت است و عاریت
بر مناسب شادی و بر قافیت

معنی آں باشد کہ بستاند ترا
بے نیاز از نقش گرداند ترا

معنی آں نبود کہ کور و کر کند
مرد را بر نقش عاشق تر کند

کور را قسمت خیالِ غم فزا ست
بہرۂ چشم ایں خیالاتِ فنا ست

حرفِ قرآں را ضریراں معدنند
خر نہ بینند و بپالاں بر زنند

جاوید نامہ میں "تمہید آسمانی ...." کے ذیل میں یہ شعر کسی شاعر کے حوالے کے بغیر آیا ہے:

ہر کہ عاشق شد جمالِ ذات را
اوست سیدِ جملہ موجودات را

یہ شعر مثنوی رومی ہی کی بحر میں اور مولانا ہی کے رنگ میں ہے۔ نیز منسوب بھی ان ہی سے ہے لیکن یہ بات یقیناً باعث تعجب ہوگی کہ مثنوی رومی کے ایرانی اور کانپوری نسخوں میں جو راقم کے مطالعہ میں ہیں، یہ شعر کہیں نظر نہیں آیا، ہر چند پوری مثنوی کا ایک ایک شعر دیکھا گیا، لہٰذا مجبوراً اس سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔

---

[۱] سورۂ یٰسین، آیۃ ۶۸ اور ہم جس کی عمر زیادہ کر دیتے ہیں اس کو طبعی حالت میں الٹا کر دیتے ہیں (یعنی اس کے تمام قویٰ حسن و جمال، رنگ وغیرہ میں تغیر آ جاتا ہے اور وہ بگڑ جاتے ہیں) سو کیا وہ لوگ نہیں سمجھتے۔

جاوید نامہ ہی میں علامہ نے "تمہید زمینی" کے باب میں مولانا رومی کی زبان سے اسرار معراج کی شرح بیان کی ہے، اور پھر مولانا کی مطلع ذیل والی غزل کے ۹ شعر درج کیے ہیں :

بکشائے لب کہ قند فراوانم آرزوست　　　بنمائے رخ کہ باغ وگلستانم آرزوست

مولانا کی اس غزل پر اس سے قبل "اسرار خودی" کے ذیل میں بحث ہو چکی ہے۔

مذکورہ غزل کے بعد علامہ نے روح رومی سے موجود و ناموجود اور خوب و بد کی حقیقت پوچھی ہے، جس کے جواب میں روحِ رومی انھیں شعور کے مدارج و مقامات کے بارے میں بتاتی ہے، اور یہ کہ انسان کس طرح اپنے نور، دوسروں کے نور اور آخر کار نور حق سے آشنا ہوتا ہے .... پھر فلسفۂ معراج بیان ہوا ہے، اس کے بعد روح رومی عقل و عشق کا موازنہ کرکے موخر الذکر کو افضل و برتر قرار دیتی ہے، اس حصے میں رومی کے ان دو اشعار سے استفادہ کیا گیا ہے :

آدمی دید است باقی پوست است　　　دید آں باشد کہ دید دوست است

جملہ تن را در گداز اندر بصر　　　در نظر رو در نظر رو در نظر

مثنوی رومی کے دفتر اول میں قیصر روم کے ایلچی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ بیان ہوا ہے، مذکورۂ بالا پہلا شعر اسی حصے میں ہے، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں قیصر روم کا ایک ایلچی مدینہ پہونچتا اور لوگوں سے پوچھتا ہے کہ تمھارے خلیفہ کا محل کس طرف ہے؟ لوگ اسے بتاتے ہیں کہ ان کا قصر وصر کوئی نہیں ہے، وہ تو درویشانہ زندگی بسر کر رہے ہیں، یہاں مولانا قصر کی بحث چھیڑتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کی چشم دل میں خرابی ہو وہ قصر سرمدی کیونکر دیکھ سکتے ہیں، پہلے چشم دل کی بیماری دور کرنا شرط ہے، پھر اس قصر کی توقع رکھنا چاہیے، اگر جان ہوا و ہوس اور دنیوی آلایشوں سے پاک ہے تو جلد ہی اسے دربار و ایوان پاک کا دیدار ہو سکتا ہے۔ آگے چل کر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال پیش کی گئی ہے کہ چونکہ آپ صلعم ہر قسم کی آلایش اور ہوس سے دور تھے، اس لیے جس طرف بھی سرکار دو عالمؐ توجہ فرماتے اسی طرف "وجہ اللہ"



ہوتا، اس کے بعد مولانا اپنے مخاطب سے کہتے ہیں کہ تم تو وسوسوں کا شکار ہو، تمھیں "وجہ اللہ"[1] کا دیدار کیونکر نصیب ہو سکتا ہے ..... حق دوسروں کے درمیان اسی طرح نمایاں ہے جس طرح چاند ستاروں میں، اس نکتہ کو مزید روشن کرنے کے لیے مولانا فرماتے ہیں کہ تم ذرا اپنی دونوں آنکھوں پر انگلیاں رکھ لو، پھر بتاؤ کہ یہ دنیا تمھیں نظر آتی ہے؟ ظاہر ہے نظر نہیں آتی، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہ ہوگا کہ دنیا ہی معدوم ہو گئی ہے، دنیا تو اپنی جگہ برقرار ہے، البتہ یہ قصور انگلیوں کا ہے کہ وہ بینائی میں حائل ہوئیں، طالب دیدارِ حق کے لیے لازم ہے کہ اس کی چشم بصیرت پر جو آلایش و ہوس کی انگشت رکھی ہوئی ہے اسے ہٹالے یہاں حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی امت کا ذکر آ گیا ہے، آپؑ کی امت نے جب آپ سے پوچھا کہ ثواب کہاں ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا: "وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَ"[2] کے اس جانب "جب کسی نے چہرہ اور سر کپڑے سے ڈھانپ رکھا ہو تو آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اسے کچھ نظر نہ آئے گا، یہی مثال ان لوگوں پر صادق آتی ہے جو بصیرت و معنویت سے عاری اور حرص و ہوس اور دنیا کے غلام اور خود بینی میں مستور ہیں، ایسے چشم ظاہر رکھنے والے دیدار حق سے بے بہرہ ہی رہتے ہیں، یہاں مولانا فرماتے ہیں کہ آدمی نام ہی "دید" کا ہے، بصورت دیگر وہ بیکار شے ہے، اور "دید" بھی وہ جو "دید دوست" ہو، اگر نظروں کو دیدار دوست سے کوئی سروکار نہیں تو ان کا اندھا ہو جانا بہتر، اور دوست وہ جو ہمیشہ قائم و باقی رہنے والا ہے، فانی و بے ثبات دوست سے دوری اچھی ....

---

[1] وجہ اللہ، سورۃ البقرہ، آیۃ ۱۱۲ : جو کوئی شخص بھی اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو تو ایسے شخص کو اس کا عوض ملتا ہے، اس کے پروردگار کے پاس پہونچ کر، اور نہ ایسے لوگوں پر (قیامت میں) کوئی اندیشہ ہے، اور نہ ایسے لوگ اس روز مغموم ہونے والے ہیں [2] سورۂ نوح آیۃ ۷ : اور میں (یعنی نوح) نے جب کبھی ان کو (دین حق کی طرف) بلایا، تاکہ آپ ان کو بخش دیں تو انھوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں دے لیں اور (نیز زیادتی کراہت سے) اپنے کپڑے (اپنے اوپر) لپیٹ لیے، اور اصرار کیا، اور (میری اطاعت سے) غایت درجہ کا تکبر کیا۔

یہ تمام باتیں گویا اہل مدینہ نے قیصر کے ایلچی سے کہی تھیں، چنانچہ جب اس نے یہ الفاظ "تر" سنے تو اس پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی، وہ حضرت عمرؓ کے دیدار کا کچھ زیادہ ہی مشتاق ہوا، اس نے سب ساز و سامان ایک طرف پھینکا، گھوڑے کو ایک جانب چھوڑا اور دیوانہ وار اس مردِ خدا (عمرؓ) کی تلاش میں سرگرداں ہوا، کہ اس دنیا میں ایک ایسی ہستی بھی ہے جو اس میں رہتے ہوئے بھی جسم میں روح کی مانند پوشیدہ و پنہاں ہے، اس نے حضرت عمرؓ کی تلاش و جستجو جاری رکھی تاکہ دل و جان سے ان کا غلام ہو جائے، اور آخر اس نے انہیں کھجور کے ایک درخت کے نیچے لیٹے ہوئے پا لیا ...... اتنی داستان بیان کرنے کے بعد مولانا نے حضرت عمرؓ اور ایلچی کے درمیان گفتگو کا تذکرہ کیا جس میں مختلف مسائل پر بحث کی گئی ہے:

ہر کرا ہست از ہوسہا جان پاک
زود بیند حضرت و ایوان پاک

چوں محمدؐ پاک شد از نار و دود
ہر کجا رو کرد وجہ اللہ بود

چوں رفیقی وسوسہ بدخواہ را
کے بہ بینی ثَمَّ وَجْہُ اللہ را

ہر کرا باشد ز سینہ فتح باب
او زہر ذرہ بہ بیند آفتاب

حق پدید است از میانِ دیگراں
ہمچو ماہ اندر میانِ اختراں

دو سرِ انگشت بر دو چشم نہ
ہیچ بینی از جہاں؟ انصاف دہ

ور نہ بینی، ایں جہاں معدوم نیست
عیب جز ز انگشت نفس شوم نیست

تو ز چشم انگشت را بر دار ہین
واں گہانی ہر چہ می خواہی بہ بیں

نوح را گفتند امت کو ثواب؟
گفت او: زاں سوئے واستغشوا ثیاب

رو و سر در جامہا پیچیدہ اند
لاجرم بے دیدہ و بے دیدہ اند

آدمی دیدہ است و باقی پوست است
دیدہ آنست آنکہ دید دوست است

چونکہ دید دوست نبود کور بہ
دوست کو باقی نباشد دور بہ[1]

---

[1] (حاشیہ ص ۱۲۱ پر)



چوں رسولِ روم ایں الفاظ تر
در سماع آورد شد مشتاق تر

دیدہ را بر جستنِ عمرؓ گماشت
رخت را و اسب را ضایع گذاشت

ہر طرف اندر پے آں مرد کار
می شدی پرسانِ او دیوانہ وار

کایں چنیں مردے بود اندر جہاں
وز جہاں مانند جاں باشد نہاں

جُست او را تا ز جاں بندہ شود
لاجرم جویندہ یابندہ بود

دوسرا شعر "مجلہ تن را ور گذار ...... الخ" مثنوی رومی کے چھٹے دفتر میں بہ تغیر مصرعِ اول آیا ہے،[1] اس دفتر میں ایک جگہ حضور فخر انبیاء، سرور کائنات صلعم کی ایک حدیث مبارکہ "لیس للماضین ہم الموت وانما الھم حسرۃ الفوت"[2] کی تشریح بیان ہوئی ہے، اس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

راست فرمود آں سپہدار بشر
کہ ہر آں کو کرد از دنیا گذر

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ صحیح فرمایا ہے کہ جو کوئی اس دنیا سے کوچ کر گیا اسے موت کا کوئی درد و دریغ نہیں، بلکہ اسے اپنے اعمال ضایع ہو جانے کا بیحد افسوس ہے کہ اس نے موت کو مرکز توجہ کیوں نہ بنایا جو ہر دولت اور ساز و برگ کی مخزن ہے، یہاں مولانا مردہ کی اس حسرت کا اب دوسرے انداز میں ذکر کرتے ہیں، ان کے مطابق اس حسرت و غم کے مارے مردے گویا وہ لوگ ہیں جو عمر بھر اپنے بھنگے پن کے سبب بیہودہ و بیکار خیالات و مشاغل کے پجاری رہے، آخر موت نے ان کا بھنگا پن دور کر دیا اور ان پر اپنے ان خیالات کی بیہودگی و بے سامانی کھل گئی، مولانا ایسے خیالات کو نقش باطل قرار دیتے ہوئے سمندر اور

---

(حاشیہ صفحہ ۱۲۰): سعدیؒ کہتے ہیں:

دیدہ را فائدہ آنست کہ دلبر بیند
ور نہ بیند چہ بود فائدہ بینائی را

(کلیات سعدی ص ۶۹۷)

[1] ملاحظہ ہو مثنوی معنوی ص ۱۱۱۵، کتاب مثنوی ص ۵۶۷، مثنوی شریف کانپور، ج ۶، ص ۳۰ [2] گذشتگان کو موت کا غم نہیں بلکہ انہیں اس بات کی ندامت ہے کہ ان کے احوال در کسب حال ضایع ہو گئے۔

اس میں پیدا ہونے والی جھاگ کی بحث چھیڑ دیتے ہیں اور اس کے بعد حقیقت بیں نظر پیدا کرنے کی تلقین فرماتے ہیں، گوشت پوست تو حیوانوں کا بھی ہوتا ہے، انسان اور حیوان میں فرق شعور و ادراک یا دوسرے لفظوں میں نظر کے سبب ہے۔ لہٰذا اگر انسان ان چیزوں سے عاری ہے تو اس میں اور گدھے میں کوئی فرق نہیں۔ بقول سعدی:

آدمی را عقل باید در بدن ورنہ جاں در کالبد دارد حمار[1]

مولانا فرماتے ہیں کہ نہ تو تمہاری چربی سے شمع جل سکتی ہے اور نہ تمہارے گوشت ہی سے کسی مخمور کے لیے کباب تیار کیے جا سکتے ہیں، گویا یہ گوشت یہ چربی تمہاری سب سراسر بیکار شے ہے، اصل بات یہ ہے کہ اپنی حقیقت و ماہیت کو پہچانو اور انسانیت میں ترقی کرنا چاہو تو نظر پیدا کرو، نظر دو قسم کی ہے، ایک تنگ نظر ہوس پرستوں کی مادہ پرست نظر جو تھوڑی دور تک دیکھ سکتی ہے، اور دوسری وہ جو دونوں جہانوں کے علاوہ خدا کا بھی دیدار کر سکتی ہے، ان دونوں میں بڑا فرق ہے، لہٰذا "واللہ اعلم بالاسرار" کے سرمہ کی تلاش کرو، تم نے بحر نیستی کی شرح تو سن ہی لی، اب کوشش کرو کہ ہمیشہ اسی بحر میں رہو، اس دنیا کی اصل ہی نیستی ہے، جتنے بھی مردان خدا ہیں وہ نیستی و انکسار کے متلاشی رہتے ہیں ؎

قبلہ کردم من ہمہ عمر از حول آں خیالاتے کہ گم شد در اجل
حسرت آں مردگاں از مرگ نیست زانست کاندر نقشہا کردیم ایست
ندیدیم آنکہ ایں نقش است و کف کف ز دریا جنبد و یابد علف
چونکہ بحر افگند کفہا را بہ بر رو بگورستان و کفہا را نگر
پس بگو کو جنبش و جولانتاں بحر افگندہ است در بحرانتاں
تا بگویند بلب نے بل بحال کہ ز دریا کن نہ از ما ایں سؤال

---

[1] کلیات سعدی ص ۳۴۹۔



نقش چوں کف کے بجنبد بے ز موج خاک بے بادے کجا آید بر اوج
چوں غبار نقش دیدی باد بیں کف چو دیدی قلزم ایجاد بیں
ہیں ببیں کز تو نظر آید بکار باقیت شحمے و لحمے پود و تار
شحم تو در شمعہا نفزود تاب لحم تو مخمور را ناید کباب
درگداز ایں جملہ تن را در بصر در نظر رو در نظر رو در نظر
یک نظر دو گز ہمی بیند ز راہ یک نظر دو کون دید و روئے شاہ
درمیان ایں دو فرقے بے شمار سرمہ جو "واللہ اعلم بالسرار"
چوں شنیدی شرح بحر نیستی کوش تا دائم دریں بحر ایستی
چونکہ اصل کارگاہ ایں نیستی است کو خلا و بے نشان است و تہی است
جملہ استادان پئے اظہار کار نیستی جویند و جائے انکسار

جاوید نامہ ہی میں فلک مشتری کی سیر کے ضمن میں زندہ رود اور حلاج کی گفتگو کا منظر پیش کیا گیا ہے، جس میں حلاج تقدیر و جبر پر روشنی ڈالتے ہیں، اس حصے کے آخر میں رومی کے مندرجہ ذیل چار[2] اشعار کا حوالہ دیا گیا ہے:

بود گبرے در زمان بایزید گفت او را یک مسلمان سعید
خوشتر آں باشد کہ ایمان آوری تا بدست آید نجات و سروری
گفت "ایں ایماں اگر ہست اے مرید آں کہ دارد شیخ عالم بایزید
من ندارم طاقت آں تاب آں کاں فزوں آمد ز کوششہائے جاں

یہ چاروں اشعار دفتر پنجم میں "دعوت کردن مسلمانے گبرے را باسلام در عہد بایزید" کے

---

[2] مولانا نے ایک دو جگہ اسی قسم کے عنوان کے تحت اشعار ارشاد کیے ہیں، "دعوت کردن مسلمانے مغی را" ... اسلام وجواب گفتن او" کلام مثنوی ص ۹۱۹

تحت آتے ہیں۔ اس حکایت کے بیان سے دراصل ان مسلمانوں کا ذکر مقصود ہے جو ایمان رکھنے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن قرآن کا ایمان
پختہ ہوتا ہے اور نہ وہ کسی طور اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ جب اس قسم کا کوئی شخص کسی کافر کو دعوتِ اسلام دیگا تو ظاہر ہے اس کا کافر پر کیا اثر ہوگا۔
اثر تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ خود وہ شخص اسلام کا عملی نمونہ ہو۔۔۔ حکایت کچھ اس طرح ہے کہ بسطام کے مشہور صوفی بزرگ بایزید کے زمانہ میں کسی مسلمان
نے ایک آتش پرست سے کہا کہ بھائی اگر تم اسلام قبول کر لو تو کتنا اچھا ہو۔ اس سے تمھیں نجاتِ اخروی کے ساتھ ساتھ یہاں عزت و سربلندی بھی حاصل
ہوگی۔ اس مومن نے جواب دیا کہ میاں اگر اسلام وہ ہے جو بایزید کا ہے تو اس کی مجھ میں ہمت و طاقت نہیں، اس لیے کہ اسلام تو جان کی بہت بڑی بھاری
ہے اور اگرچہ میں دین و ایمان پر یقین نہیں رکھتا تاہم اس (بایزید) کے ایمان کا قائل ہوں لیکن اگر تم اہل اسلام کی بات کرتے ہو جس کا عملی نمونہ تم
خود ہو تو اسے میرا دور سے سلام، مجھے ایسے اسلام سے کوئی رغبت ہے، نہ اس کی کوئی خواہش کہ تمھارے مقابلہ میں میں اب بھی
بڑھ کر ہی ہوں، پھر یہ بھی ہے کہ تمھارے اعمال کی جو صورت ہے اس سے تو مائل بہ اسلام شخص بھی دور بھاگے گا۔۔۔

بود گبرے در زمانِ بایزید گفت او را یک مسلمانِ سعید
گرچہ باشد گر تو اسلام آوری تا بیابی صد نجات و سروری[1]
گفت "ایں اسلام اگر ہست اے مرید آنکہ دارد شیخِ عالم بایزید
من ندارم طاقت آں تابِ آں کاں فزوں آمد ز کوششہائے جاں
گرچہ در ایمان و دیں ناموقنم لیک در ایمانِ او بس مومنم
دارم ایماں کو ز جملہ برتر است بس لطیف و با فروغ و با فراست
مؤمنِ ایمانِ اویم در جہاں گرچہ مہرم ہست محکم بر دہان
باز ایماں گر خود ایمانِ شماست نے بداں میلستم و نے اشتہاست
آنکہ صد میلش سوئے ایماں بود چوں شما را دید آں باطل شود
زانکہ نامے بیند و معنیش نے چوں بیاباں را مفازہ گفتنی
چوں بایمانِ شما او بنگرد عشقِ او ز آوردِ ایماں بفسرد

[1] یہ شعر ایرانی اور دوسرے نسخوں میں اسی طرح ہے ملاحظہ ہو مثنوی شریف دفتر پنجم ص ۸۹، کتاب مثنوی ص ۸۵۶، مثنوی معنوی ص ۴۹۹۔



# بہادر شاہ ظفر کے عہد کے منشی رجب علی کی غدّاریوں کے شواہد[1]

از

جناب ضیاء الدین صاحب اچھرہ، لاہور

آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری میں انگریز کے جن خیر خواہوں نے نمایاں کردار ادا کیا، اُن میں میرزا الٰہی بخش اور منشی رجب علی سر فہرست دکھائی دیتے ہیں، یہ انہوں ہی کا کارنامہ تھا کہ جنرل بخت خاں بادشاہ کو اپنے ہمراہ نہ لیجا سکے، اور میجر ہڈسن اپنا شکار حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا، جس کے بعد بادشاہ کو اسیر ہو کر رنگون جانا پڑا، متعدد شہزادے بے شمار رہنمایانِ انقلاب اور ہزاروں محبِ وطن افراد قتل ہوئے، اور خیر خواہوں کو انعام و اکرام حاصل کرنے کا موقع ملتا رہا،

"تاریخوں میں زیادہ تر میرزا الٰہی بخش کو سب سے زیادہ موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے، اور منشی رجب علی کی غداری کو نسبتاً زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی، اور بادشاہ کے ہمایوں کے مقبرے سے نکلنے کی ہی وہاں میجر ہڈسن کی موجودگی مان لی جاتی ہے، انڈیا آفس لائبریری میں متفرق فائلوں کی

[1] اس مضمون میں شامل انڈیا آفس لائبریری اینڈ ریکارڈز لندن کی دستاویزات (کراؤن کاپی رائٹ) کی اشاعت اور ترجمہ کی اجازت کے لئے کنٹرولر آف ہر مجیسٹیز سٹیشنری آفس شکریہ کے مستحق ہیں۔

ورق گردانی کرتے ہوئے مجھے ایک فائل میں چند ایسے شواہد دستیاب ہوئے جن سے ان واقعات کی بابت ذرا مختلف حالات کا پتہ چلتا ہے، ان دستاویزات میں منشی رجب علی کا کردار بہت نمایاں دکھائی دیتا ہے، اور اس سلسلہ میں جہاں دوسروں کی زبانی اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں وہاں وہ خود رجب علی بادشاہ اور شہزادوں کی گرفتاری کا سہرا بلا شرکت غیرے اپنے سر باندھتا نظر آتا ہے، اور اس دعوے کے ثبوت میں متعلقہ حکام کی اسناد پیش کی جائیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ وہ خود یہ دعوی کرتا ہے کہ بادشاہ کو مقبرۂ ہمایوں سے نکال لانے کے بعد نصف ماہ میں اس کی اطلاع پر میجر ہڈسن اس کے ساتھ شریک ہوا۔

منشی رجب علی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران انگریزی حکومت کے شعبۂ جاسوسی کا باقاعدہ تنخواہ دار ملازم تھا، اس کے کام کی اہمیت اور اس کی اہلیت کا اندازہ تاریخ عروج عہد سلطنت انگلشیہ ہند منشی ذکاء اللہ دہلوی کے اس بیان[55] سے بخوبی ہو سکتا ہے،

"سرکار انگریزی کے جو ایجنٹ، اس مخبری کے لئے کہ دشمن کیا حرکتیں کرتا ہے دلی میں رہتے تھے، ان سب کے سردار منشی رجب علی تھے، جاسوسی کے لئے جو اعلیٰ درجے کی لیاقتیں چاہئیں وہ ان میں تھیں، انگریزی منتظموں کو ان پر پورا اعتماد تھا، وہ ہمیشہ اپنے کارفرماؤں کے ساتھ راست باز رہے، سچی بات دریافت کر لینے کی عجیب قابلیت واستعداد اور فراست وکیاست رکھتے تھے،"

انگریزوں سے اس کے تعلقات کی نوعیت منشی رجب علی کے سوانحی خاکہ کے اہم اقتباسات سے بخوبی ظاہر ہو گی جو اس نے اپنے خاندانی حالات کے ضمن میں "تحقیقات چشتی" میں درج کرائی، ملاحظہ کیجئے :-

[55] بحوالہ "۱۸۵۷ء" مولانا غلام رسول مہر، کتاب منزل لاہور، صفحہ ۱۳۴ / ۵۱ "تحقیقات چشتی"، تو لفہ نور احمد چشتی، پنجابی ادبی اکیڈمی، لاہور ۱۹۶۴ء، صفحات ۱۸ تا ۵۲۲



"حال راقم کا یہ کہ ۱۸۰۶ء سمت ۱۸۶۳ بکرماجیت بمقام تونڈی اپنی جاگیر میں تولد ہوا، سمت ۱۸۶۴، ۱۸۰۷ء میں دیوان محکم چند، افسر فوج مہاراجہ رنجیت سنگھ نے تونڈی کو مع دیہات بے سبب بلاوجہ ضبط کر کے ہمارے بزرگوں کو جلاوطن کر دیا، وہاں سے نکل کر جگراؤں میں آئے، سردار فتح سنگھ بہادر آہلو والیہ نے محض عالی جاہی سے دو حویلیاں لائق واسطے اقامت کے جگراؤں میں عطا کیں، اور پھر راجہ نہال سنگھ ان کے فرزند نے کچھ زمین باغ کے لئے بخشش دی، اور ہمیشہ مہربانی کرتے رہے ......"

۱۸۲۵ء میں دہلی میں مدرسہ تجویز ہوا، حکام در پئے اشاعت علوم متوجہ ہوئے تو راقم نے بھی علوم متداولہ بتمامہ وہاں حاصل کیا، اور مدرسۂ دہلی میں مدرس علم ریاضی[56] کا رہا، حکام حضور چارلس مٹکاف صاحب بہادر اور ایلیٹ صاحب بہادر ریزیڈنٹ دہلی عنایت کرتے رہے، خصوصاً سر چارلس ٹریولین صاحب بہادر جو اب مدراس میں گورنر ہیں، ان کی عنایتوں کی تو نہایت نہیں، بہت نظر عنایت میرے حال پر مبذول تھی، بلکہ جب حضور لارڈ ہارڈنگ صاحب گورنر جنرل ہندوستان نے دہلی میں بعد فتح بھرت پور دربار کیا تو میں بھی بذریعہ رضیہ انہی صاحبان جلیل الشان کے حاضر دربار ہو کر خلعت عزت وممتاز ہوا، اور بمقتضائے قدردانی علم کے پیش گاہ بندگان حضور لارڈ گورنر جنرل بہادر سے دربار میں کرسی بھی مرحمت ہوئی، ۱۸۳۰ء میں بعد

[56] علم ریاضی کی تحصیل میں منشی رجب علی کو سر سید احمد خاں کے نانا نواب دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین احمد خاں کی شاگردی کی سعادت حاصل ہے، جو اس علم میں بہت ماہر سمجھے جاتے تھے، (دیکھئے حیات جاوید مؤلفہ الطاف حسین حالی، انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۳۹ء، حصہ اول ص ۱۹)

قطع تعلق مدرسہ آگرہ گوالیار وارد ہوشنگ آباد ہوا، تب جان ریف اوسلی صاحب
بہادر وہاں حاکم تھے، تعریف اُن کے اخلاق کی بیرون از احاطۂ تحریر ہے خصوصاً جو
مجھ پر عنایتیں کرتے تھے ہیں بیان ان کا نہیں کر سکتا۔۔۔۔"

"جب وارد انبالہ ہو کے ملازمت حضور آنریبل سر جارج رسل کلارک
صاحب بہادر، جن کے اوصاف سے زبانِ قلم قاصر ہے، حاصل کی تو صاحب موصوف نے
یکم فروری ۱۸۴۳ء کو بخدمت منشی گری ملک محفوظہ مابین جمن و ستلج اوّلاً و میر منشی ممالک
پنجاب ثانیاً مامور فرمایا جب سے خدمت جارج براڈفٹ صاحب بہادر و حضور ہنری میک
گریگر بارنٹ صاحب بہادر و سر ہنری لارنس بہادر و بندگان حضور مسٹر جان لارنس صاحب بہادر جو بفضل الٰہی
مسند آرائے محکم گورنری کشور ہند ہیں، بمقدور خود کاروبار میں سرگرم رہا، انہی
گورنر جنرل بہادر کو، جب حاکم اعلیٰ لاہور کے تھے، ۱۸۵۳ء میں استعفا دے کر بحصول
رخصت و خلعت و خطاب انگریزی و جاگیر وارد جگراؤں ہوا، بعد اس کے حسب الطلب
سر ہنری لارنس صاحب بہادر ملک راجپوتانہ کا بھی سر کیا۔۔۔۔"

"۱۸۵۷ء میں بمقام دہلی بالائے پہاڑی کیمپ سرکار میں بعہدۂ میر منشی گری
کمانڈر انچیف بہادر معزز و ممتاز ہو کے تحت جناب جرنیل بیچر صاحب بہادر جو کچھ
خدمت مجھ سے ہو سکی اس سے قاصر نہ رہا، بعد تسخیر دہلی بحصول رخصت وطن میں
آیا، جب جارج کارنک بارنس صاحب بہادر کمشنر ایں روئے ستلج نے رپورٹ
اہل خدمت کی کی تو پیش گاہ لارڈ کیننگ صاحب بہادر گورنر جنرل کشور ہند و وائسرائے سے
خلعت پانچ ہزار روپیہ بذریعہ بندگان حضور سر جان لارنس صاحب بہادر گورنر
جنرل حال مرحمت ہوا اور کچھ جاگیر بھی عطا ہوئی اور خطاب ارسطو جاہ کا ملا، اور
خطاب خان بہادر کا عام لاہور میں پیش گاہ لارڈ ہارڈنگ صاحب بہادر گورنر جنرل



سابق سے عطا ہو چکا تھا، ۱۸۶۱ء و ۱۸۶۳ء میں براہ سکھر و کراچی و بمبئی و عدن
مشرف بہ حج و زیارت ہو کر وارد جگراؤں ہوا، اور بتقریب سیر عجائب خانہ کے بھی
بحضور صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب حاضر ہو کر مورد مراحم بے پایاں
ہوا، اور شکر گذار عنایت مرخص ہوا۔۔۔۔"

"جناب باری اس دولتِ انگلشیہ کو روز بروز ترقی بخشے کہ طرح طرح
کی ترقیات کشور ہندوستان میں بہ نیت نیک حکام سپہر مقام عمل میں آئی ہیں،
اگرچہ مجھ میں کوئی لیاقت اور قابلیت نہیں، مگر الحمد للہ کہ اوقات میرے عزت
و آبرو سے بسر ہوئے، حکام عہد ہمیشہ عزت افزائی میں مصروف رہے اور امثال
و اقران میرے مجھ کو ہمیشہ بنظرِ اعتبار و اقتدار دیکھتے رہے صاحبان ڈپٹی کمشنر
بہادر لدھیانہ ابتدا سے آج تک مجھ پر نظرِ عنایت مبذول رکھتے ہیں، چنانچہ آج
چارلس ایلیٹ صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر حال بہت نظرِ عنایت رکھتے ہیں۔"

یہ ہے منشی رجب علی کی زندگی کا ایک مختصر خود نوشت خاکہ، اگرچہ اس میں انھوں نے
۱۸۵۷ء کے دوران انجام دی جانے والی اپنی خصوصی کارگذاریوں کی نشان دہی نہیں
کی، تاہم اس کی روشنی میں اُس کے ان کارہائے نمایاں کا پس منظر سمجھنے میں آسانی ہو جاتی
ہے، جن کا ذکر انڈیا آفس ریکارڈز کے حوالہ سے ذیل میں کیا جاتا ہے۔

انڈیا آفس لائبریری میں امیدوارانِ تمغہ "ستارۂ ہند" کے ذاتی کاغذات پر مشتمل چند
فائلیں موجود ہیں، ہر فائل میں متعدد امیدواروں کی دستاویزات ہیں، منشی رجب علی کے
کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے "اسٹار آف انڈیا" دینے کی تحریک ۱۸۶۶ء میں ہوئی،
جس کی پیروی لندن میں مقیم ایک شخص سید عبداللہ[1] نامی کر رہا تھا، سید عبداللہ کی طرف سے ۱۴ دسمبر ۱۸۶۶ء

[1] (حاشیہ ص ۱۳۰ پر)

کی تحریر کردہ پہلی درخواست دفتر میں دو روز بعد ۱۶ دسمبر ۱۸۶۶ء کو اندراج کی گئی۔ بعد میں ایک اور درخواست محررہ ۱۰ مارچ ۱۸۶۹ء پر رجسٹری ڈیپارٹمنٹ انڈیا آفس کی اگلے روز یعنی ۱۱ مارچ کی وصولی کی مہر درج ہے۔ کاغذات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی رجب علی کو اس سے پیشتر اس کی خدمات کے اعتراف میں انعام و جاگیر سے نوازا گیا تھا، مگر وہ اس عطیہ سے مطمئن نہ تھا اور اس کے ہمدرد و رفقا بھی اسے تسلی بخش نہیں سمجھتے تھے۔ مزید نوازشات کے لیے اس کی بھاگ دوڑ ایک عرصہ تک جاری رہی۔ اپنے بیان میں وہ اس سلسلہ میں کی جانے والی مسلسل تگ و دو کا ذکر کرتا ہے۔ اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی کے ثبوت میں وہ ایک ایسے خیر خواہ کی مثال پیش کرتا ہے جس کی کارگذاریاں اس کی خدمات کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہ رکھتی تھیں، لیکن اسے ایک بھاری جاگیر عطا کی گئی۔ وہ اپنی خیر خواہی اور جان نثاری کے کارناموں کی زبردست اہمیت جتلا کر ان کے صلہ میں حاصل کردہ جاگیر کو معمولی اور ناکافی قرار دیتا ہے۔

فائل مذکور میں منشی رجب علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک فارسی خط بھی موجود ہے، جس کی نقل زیر نظر مضمون میں شامل ہے۔ اس خط کے مندرجات اس لحاظ سے خاصے دلچسپ ہیں کہ ان میں انگریزوں کے شعبۂ جاسوسی کا "نامور" اور کامیاب ترین اہل کار جہاں ایک جانب "برائے استحکام سرکار انگریزی" مفاد عامہ کے خلاف گہری سازشوں میں ملوث نظر آتا ہے، وہاں دوسری جانب وہ اپنی تمام کمائی رفاہ عامہ کے کاموں، مسجدوں اور کنوؤں کی تعمیر اور خیراتی کاموں میں صرف کر دینے کا دعویٰ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ بقول ظہیر دہلوی[2]

(حاشیہ ص ۱۲۹) اس شخص کا ذکر مجھے کہیں دستیاب نہیں ہو سکا سوائے حیات جاوید کے، جہاں مولانا حالی نے اس کے ایک طویل مضمون کا ذکر کیا ہے، جو اس نے سر سید احمد خاں کی تحریک میں ۱۸۶۹ء میں ان کے دورۂ لندن کے فوراً بعد وہاں کے ایک اخبار میں شائع کرایا تھا (دیکھئے حیات جاوید ج ۱، ص ۱۴۳، ۱۴۴)

[2] "داستان غدر" مصنفہ ظہیر دہلوی اکادمی پنجاب لاہور ۱۹۵۵ء، ص ۱۶۲۔



مصنف و مدون "داستان غدر":

"مقبرہ ہمایوں کے واقعہ کے بعد مسلمانوں کو مولوی رجب علی اور ان کے خاندان سے عقیدت کم ہو گئی تھی، تاہم مولوی رجب علی نے تلافی مافات کے طور پر دہلی کے ستم رسیدہ لوگوں کی حتی الامکان امداد کی۔"

اور اس کے بعد وہ فلاح و بہبود کے کاموں میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ اس کے پیچھے کیا جذبہ کارفرما تھا، تلافی گناہ، عوام میں کھوئی ہوئی عزت اور وقار کی بحالی یا کچھ اور؟ مقصد کوئی بھی ہو، اس عالم پیری میں بھی وقت پڑنے پر "انگریز بہادر" کی سربلندی کے لیے اپنی جان تک قربان کر دینے کے دعوے کی برقراری اس کے ذہن اور کردار کی عکاسی کرتی ہے۔

مذکورہ دستاویزات میں سے چند تو انگریزی میں نقل مطابق اصل ہیں، باقی کا انگریزی ترجمہ منشی رجب علی کے پیروی کنندہ سید عبداللہ نے کیا ہے، اور یہ زیادہ تر انہی کے ہاتھوں کی تحریر کردہ ہیں۔ ذیل میں ان دستاویزات کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو موضوع زیر بحث سے متعلق ہیں۔ یہ وضاحت بھی کر دوں کہ میں نے ان کے آزاد ترجمہ کی بجائے ترجمہ مطابق اصل کو ترجیح دی ہے۔

**بیان منشی رجب علی**[1]

۱۸۴۶ء میں سکھوں کے دائمی یادگار معرکہ کے دوران میں نے آں جہانی میجر جارج براڈفٹ صاحب بہادر کے ماتحت سرکار برطانیہ کے لیے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اہم واقعات کے اس دور میں اپنی جان اور مال سے یکساں قطع نظر جب بھی فرائض منصبی نے مجھ سے ان کی قربانی طلب کی، میں نے سر پر منڈلاتے ہوئے سخت خطرات میں ہر موقع پر اپنی جان جوکھوں میں ڈالی۔ جان نثاری کی اس کیفیت نے مذکورہ بالا ممتاز افسر کی نظر عنایت اس طرف مبذول کی، اور انہوں نے

[1] انڈیا آفس ریکارڈز، فائل نمبر L/P&S/15/73 ورق ۷۷۸۔

سر فریڈرک کری بارٹ صاحب بہادر کی موجودگی میں وعدہ کیا کہ وہ نو مواضع کی ایک جاگیر، جو میری موروثی جائداد تھی، مجھے عطا فرمائیں گے، مگر یہ وعدہ جو سر فریڈرک کری بارٹ صاحب بہادر کے دستخطوں سے توثیق کیا گیا تھا، میجر براڈفٹ صاحب بہادر کے افسوسناک انتقال کے باعث کالعدم ہوگیا، بعد ازاں سر فریڈرک کری بارٹ صاحب بہادر کی نوازش سے میں اس قابل ہوا کہ اپنا معاملہ ارباب اختیار کی خدمت میں دوبارہ پیش کرسکوں۔ لازوال یادگار کے مالک کرنل سر ہنری منٹگمری لارنس صاحب بہادر نے بلاحظہ سرکار میرے حق میں رپورٹ تحریر کی، اس عرضی کے نتیجہ میں موضع تلونڈی اور دوسرے مواضع، جو میری موروثی جائداد تھے اور جن کی سالانہ جمع دو ہزار روپے تھی، مع ایک اور موضع کے جسے میں نے اپنی سعی و کوشش سے آباد کیا تھا، اور جس کی سالانہ جمع چار سو روپے تھی، مجھے اور میری آیندہ نسلوں کو دائمی طور پر عطا کیے گئے۔

آں جہانی سر ہنری لارنس صاحب بہادر اکثر اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کرتے تھے کہ سرکار کو میرا معاملہ تاخیر سے پیش کیے جانے کے باعث مجھے میرے قوی اور جائز دعاوی کا شایان شان صلہ نہیں دیا گیا، اور انھوں نے میرے ساتھ وعدہ کیا کہ انگلستان پہونچنے پر وہ میرے مفادات میں اضافے کی حتی المقدور کوشش کریں گے، موت نے اس قابل احترام محسن کو جو میرے دوست بھی تھے، مجھ سے چھین لیا، جنرل برنارڈ صاحب بہادر جنھوں نے دار الحکومت کے محاصرے کے دوران دہلی فیلڈ فورس کی کمان کی تھی، میری مستحکم خیر خواہی کے علاوہ مسلسل جاں فشانی اور تن دہی کے اتنے معترف تھے کہ انھوں نے مجھے مکمل یقین دلایا کہ یہ خدمات کسی صورت بھی صلہ کے بغیر نہیں رہیں گی، اور یہ کہ وہ بذات خود میرے معاملہ میں کیمپ میں کسی دوسرے فرد کی نسبت زیادہ دلچسپی لیں گے، لیکن یہ عظیم قدر شناس وقت سے پہلے ہی ہیضہ کا شکار ہوکر میجر ہڈسن صاحب بہادر اور مسٹر گریٹ ہیڈ صاحب بہادر کی طرح، جو جنرل برنارڈ



صاحب بہادر کے میرے ساتھ مذکورہ بالا وعدے کے وقت موجود تھے، ہم سے قطع تعلق کر گئے، تسخیر دہلی کے بعد کرنل بیچر صاحب بہادر نے مجھے ایک سند عطا کی اور ساتھ ہی سر جان لارنس بارٹ صاحب بہادر کے حضور، جب یہ ممتاز مدبر انبالہ میں تھے، میری پُرزور سفارش کی، میری خدمات کے عوض مجھے جو انعام دیا گیا وہ کونسل میں گورنر جنرل صاحب بہادر کے فرمان کی منسلک نقل سے ظاہر ہے، اس فرمان سے متعلق مجھے چند معروضات پیش کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔

مجھے دائمی طور پر جو دو مواضع عطا کیے گئے، ان میں سے چار سو روپے سالانہ جمع کا ایک موضع دراصل اس سفارش کی بدولت عطا کیا گیا تھا جو حضور سر جارج رسل کلارک صاحب بہادر نے کرنل سر کلاڈ مارٹن ویڈ صاحب بہادر کو فرمائی، جنھوں نے میرا معاملہ ہز ہائی نس مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر کی خدمت میں پیش کیا، سر جارج رسل کلارک صاحب بہادر کو اس صورت حال کا بخوبی علم ہے، یہ عطیہ میں نے جس وقت وصول کیا، ایک بنجر اراضی کے سوا کچھ نہ تھا، یہ صرف اس پر صرف کردہ عظیم سرمایہ اور سخت محنت و استقلال کا نتیجہ ہے جو میں اسے قابل پیداوار اور رہائش بنانے میں کامیاب ہوا، اور اب یہ پچھلے اٹھارہ برس سے میرے قبضہ میں ہے، آٹھ سو روپے سالانہ جمع کا تلونڈی کا دوسرا موضع، جو مجھے اور میرے وارثوں کو دائمی طور پر عطا کیا گیا ہے میری قدیمی جاگیر کا ایک حصہ ہے، لہٰذا میں بڑے ادب کے ساتھ گذارش کرتا ہوں کہ آنجہانی جنرل برنارڈ صاحب بہادر کے میرے ساتھ کیے گئے وعدے کے پیش نظر مجھے جو انعام دیا گیا ہے وہ کسی طور پر بھی میری کارگذاریوں کے ہم پلہ نہیں ہے، اگر میں جان نثن خان ولایتی کا حوالہ دوں تو اس کا نا کافی ہونا مزید نمایاں ہوگا، اس نے دہلی سے پہلے کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا، کسی ایک لڑائی میں بھی شریک نہیں ہوا، اور اس کے فرائض چند گھوڑ سواروں کے ساتھ ہیڈ کوارٹر تک

موجود رہنے تک مدد دو تھے، لیکن اسے بیس۲۰ ہزار روپے سالانہ جمع کی جاگیر عطا کی گئی، اس کے برعکس میں شب و روز سرکار کی خدمت میں مصروف رہا اور باغیوں کے خلاف میری جد و جہد دہلی میں ان کے سرغنوں کے لیے اس قدر اذیت کی حامل تھی کہ انھوں نے باضابطہ اعلان جاری کیا جس میں اس شخص کے لیے بیس۲۰ ہزار روپے انعام کا وعدہ کیا گیا جو انھیں مولوی سید رجب علی خاں بہادر کا سر لا کر دے۔

میں اپنے کئی معتمد ملازموں سے محروم ہو چکا ہوں جنھوں نے جاسوسوں کے طور پر کام کیا اور جو دشمن کے ہاتھوں میں پڑ کر یا تو سفاکانہ طور پر قتل کر دیے گئے یا بے دردی سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے گئے، خود باغیوں کے ساتھ بار بار میرے جھگڑے ہوتے رہے، جن میں سے ایک مقابلہ میں میرے چار سوار خطرناک حد تک زخمی کر دیے گئے اور میں انھیں ایک چارپائی پر ڈال کر کیمپ میں لایا۔

آخر میں یہ عرض ہے کہ یہ میری تنہا اور بلا شرکت غیرے ذاتی جد و جہد اور اثر آفرینی کا باعث تھا جو سابق شاہ دہلی اپنے کو حوالہ کرنے پر آمادہ ہوئے ——— اور ان کے بیٹے یعنی شہزادے کیپٹن ہڈسن صاحب بہادر کے حوالہ کیے گئے ——— اور یہ کہ سابق شاہ کے ہزاروں حامیوں سے، جنھوں نے تلواریں ہاتھوں میں لیے ہوئے مرنے کا عزم کر رکھا تھا اسلحے چھینے گئے، کرنل بیچر صاحب بہادر میرے اس تمام بیان کی سچائی کی تصدیق کریں گے۔

میں عاجزانہ طور پر واثق امید کا اظہار کرتا ہوں کہ سرکار انگلشیہ جس نے اپنے خیرخواہ حامیوں کے کارہائے نمایاں کے اعتراف اور انھیں انعامات سے نوازنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا، میرے دعاوی پر فیاضانہ غور فرمائیگی اور مجھے میری جد و جہد اور قربانیوں کے شایان انعام صلہ میں دے گی۔



فرمان گورنر جنرل ہند بنام منشی رجب علی[۱]
محررہ ۱۸ جون ۱۸۵۸ء

یہ دیکھتے ہوئے کہ فساد شروع ہونے سے قبل حسب الطلب کیپٹن ہڈسن تم دہلی کے ہیڈ کوارٹر میں پیش ہوئے اور بعد ازاں کیپٹن موصوف کے ماتحت کمانڈر انچیف کے میر منشی مقرر ہوئے، اور تم نے محکمۂ خفیہ اطلاعات میں اپنے فرائض نہایت خاطر خواہ طور پر ادا کیے۔

——— اور یہ کہ محاصرۂ دہلی کے دوران تم نے مستند خبروں کی فراہمی میں شاندار کارکردگی دکھائی۔

——— اور یہ کہ بدلی سرائے کی مہم کے دوران بھی تم موجود تھے، اور علاقہ کے زمینداروں کو اپنے مقاصد میں شریک کر کے ان کے جاسوسوں کے ذریعہ باغیوں کی روزمرہ نقل و حرکت کی اطلاعات فراہم کرتے رہے۔

——— مزید برآں یہ دیکھتے ہوئے کہ مقبرہ ہمایوں کے قریب شاہِ دہلی کی گرفتاری کے موقع پر اور دوسری صبح شہزادگان مرزا مغل، ابوبکر اور خضر سلطان کو حراست میں لیے جانے کے وقت تم میجر ہڈسن کے ہمراہ موجود تھے۔

——— اور یہ کہ اس کے علاوہ تم نے متعدد اہم اور امتیازی خدمات سر انجام دی ہیں، لہٰذا ۳۶۹۶ روپے جمع کی وہ جاگیر جو ۱۸۵۳ء میں تمھیں ضلع لدھیانہ میں جگراؤں کے نزدیک بخشی گئی تھی کہ ۲۲۹۶ روپے تمھارے نام تاحیات اور چار سو۴۰۰ روپے برائے نسلاً بعد نسل، ہماری کمال عنایت کے سبب اب اس جاگیر سے ۱۴۹۶ روپے تمھیں عمر بھر جاری رہیں گے اور ۱۴۰۰ روپے کی جاگیر نسلاً بعد نسلٍ تمھارے ان بیٹوں کے لیے ہوگی جو تمھارے اپنے خونی رشتے کے وارث ہوں۔

---

[۱] فائل مذکورہ، ورق ۷۷۹۔

چیف کمشنر پنجاب کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ تمھیں اس فرمانِ عام کے ساتھ مالیتی پانچ ہزار روپے کی ایک خلعت پیش کی جائے، تم بلاشبہہ اس اعلیٰ انعام کو، جو تمھاری ان شان دار اور موثر کارگذاریوں کے عوض عطا کیا گیا ہے، جو تم سرکار کے لیے بجالائے، اپنی آسایش اور بہبودی کا ذریعہ سمجھوگے، اور اس فرمان کو اپنے دوستوں اور ہمسروں کے درمیان ذاتی فخر اور عزت کا باعث خیال کروگے۔

اصل فرمان فارسی میں لکھا گیا تھا، جس کے انگریزی ترجمہ سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ اس فرمان میں جہاں منشی رجب علی کا بادشاہ اور شہزادوں کی گرفتاری کے موقع پر میجر ہڈسن کے ہمراہ موجود ہونے کا ذکر ہے، وہاں اس نے صرف موجودگی کے بیان کو اپنی خدمات کے مقابلہ میں کم تر سمجھ کر اس کے رد میں مندرجۂ ذیل نوٹ لکھا ہے:

یہ ایک غلطی ہے، وہ میں ہی تھا جو سابق بادشاہ دہلی کو ہمایوں کے مقبرہ سے لایا، اور نصف راہ میں کیپٹن ہڈسن صاحب بہادر کی طرف گھوڑ سوار دوڑائے۔ وہ تھوڑے ہی فاصلے پر موجود تھے اور میری طرف سے سابق بادشاہ کی سپر اندازی کی اطلاع پر فوراً میرے ساتھ آملے۔ اس کے ثبوت میں کرنل بیچر صاحب بہادر اور کرنل برن صاحب بہادر کی اسناد منسلک ہیں (مولوی سید رجب علی خاں بہادر)

سند (کرنل) اے۔ بیچر کوارٹر ماسٹر جنرل
بحق منشی رجب علی (موجودہ دہلی)
۲۹ ستمبر ۱۸۵۷ء

مجھے ان گراں بہا خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بڑی خوشی ہوتی ہے جو میر منشی مولوی رجب علی خاں بہادر نے دہلی فیلڈ فورسز کی نقل و حرکت کے دوران تمام عرصہ

ے فائل مذکورہ، ورق ۷۷۹۔



فرسٹ ای۔ بی فیوزیلیئرز کے قائم مقام کوارٹر ماسٹر جنرل لفٹیننٹ ڈبلیو۔ ہڈسن کی براہ راست ہدایات کے تحت محکمۂ خفیہ اطلاعات میں اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے انجام دیں، مئی کے مہینے سے لے کر، جب کہ کرنال میں اسی کی تشکیل ہوئی، موجودہ وقت تک مولوی رجب علی کی جدوجہد میں کوئی کمی نہیں ہوئی، بلکہ وہ بڑے دشوار حالات میں بھی مصروف کار رہا ہے، اس نے تقریباً ہر روز شہر سے خطوط کے ذریعہ لگاتار مخبری کرتے رہنے کے علاوہ دشمن کی بیرونی حرکات و سکنات کے متعلق براہ راست اور مستحکم جاسوسی جاری رکھی، میں سمجھتا ہوں کہ مولوی رجب علی نے سرکار ہند کے ساتھ قابل تعریف اور دیانت دارانہ جان نثاری کے جس اعلیٰ کردار کا ہمیشہ مظاہرہ کیا ہے، وہ اس نے عظیم آزمایش کے اس دور میں نہ صرف برقرار ہی رکھا، بلکہ اس میں بے حد اضافہ کیا، میں اس کی کارگذاریوں کو سرکار کے ہمدردانہ ملاحظہ کے لیے پیش کرتے ہوئے اس کے لیے ٹھوس اور مستقل انعام کی پرزور سفارش کرتا ہوں، وہ فتح دہلی ہی سے بادشاہ کو حوالہ کرنے کے لیے آلۂ کار بنا رہا ہے اور ان تین[۳] شہزادوں کی گرفتاری میں بھی، جو سرکار کے لیے انتہائی خطرناک تھے اور دہلی میں عیسائیوں کے بے رحمانہ قتل عام میں ملوث تھے، اور دوسرے فرائض کی بجاآوری میں اس نے بہت سارے ذاتی خطرات مول لیے، مجھے واثق یقین ہے کہ سرکار برطانیہ کے نیک مقاصد کی خاطر وہ اب بھی اپنی تلوار کو اتنا ہی استعمال کرنے کو تیار ہے، جتنا کہ اپنا قلم۔

سند از کرنل ایچ۔ پی۔ برن بنام جی۔ رکٹس، اسسٹنٹ کمشنر لدھیانہ متعلق منشی رجب علی (محررہ دہلی ۱۷ اکتوبر ۱۸۵۷ء)[1]

حامل ہٰذا مولوی سید رجب علی خاں بہادر نے مجھ سے اپنے کار
تحریر دینے کی درخواست کی ہے۔ ضلع لدھیانہ میں اپنے ایک
کی حیثیت سے آپ اسے پہلے ہی جانتے ہیں،

گزشتہ چار ماہ کے دوران اس نے محکمۂ خفیہ اطلاعات میں بڑی عمدہ خدمات انجام دی ہیں
اور جد وجہد کے آخری مراحل میں بادشاہ اور اس کے بیٹوں کو پیش کرنے کا فریضہ بھی تھا، اور
کو اس نے بذاتِ خود پیش کیا،

اس نے لاہور بورڈ آف ایڈمنسٹریشن کے تحت اس تمام عرصہ تک ملازمت کی جب
میں وہاں ڈپٹی سکریٹری تھا، سر ہنری لارنس کو جن کا وہ پنجاب کی جنگ کے دوران
معتمد (کانفیڈنشل) منشی تھا، اس پر بے حد اعتماد تھا، میرے علم میں سرکار کا کوئی
اہلکار ایسا نہیں جس نے ملک کے لئے منشی رجب علی سے بہتر خدمات انجام دی ہوں، اور
یہ سن کر بڑی مسرت ہوگی کہ اسے اس کا مناسب انعام مل گیا ہے،

چٹھی سر جان لارنس بحیثیت چیف کمشنر پنجاب بنام منشی رجب علی (محررہ لاہور، ۱۰ اگست ۱۸۵۷ء)[2]

بعد تسلیمات، تمہاری چٹھی بنام حکیم احسن اللہ
وزیر شاہ دہلی کی نقل، جو تم نے کمشنر صاحب ضلع
(ڈسٹرکٹ) کو بھیجی، مجھے مل گئی، در حقیقت اس کا انداز اور نتیجہ اس نوعیت کی تھیں کہ
جب وہ چٹھی باغیان دہلی کے ہاتھوں میں پہنچی ہوگی، تو ان کے لئے اس قدر شدید دھچکے کا باعث
ہوئی ہوگی، گویا کہ بارودخانے کے درمیان کوئی بم گرا ہو، میرا مطلب یہ ہے کہ فی الحقیقت ان
پڑھ کر انھوں نے ایک دوسرے پر کلی اعتماد کھو دیا ہوگا،

اصل چٹھی اردو میں لکھی گئی تھی جس کے انگریزی ترجمہ سے اردو میں منتقل کی گئی ہے"

[1] فائل مذکورہ، ورق ۹۷۷، [2] فائل مذکورہ، ورق ۲۲۰



فرمان سر جان لارنس وائسرائے و گورنر جنرل ہند بنام منشی رجب علی (محررہ ۳۱ اگست ۱۸۶۴ء)[1]

تمہاری ان گراں بہا خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے جو تم نے بعض اہم مواقع پر ملک
کے لئے انجام دیں یعنی:

برطانوی افواج کے افغانستان جانے کے لئے برائے حصول اجازت عبور سکھ
سرحد حاکم پنجاب سے گفت وشنید کے وقت

ان مہمات میں جو پنجاب کے برطانوی عملداری میں شمولیت کا باعث
ہوئیں، اور

۱۸۵۷ء میں محاصرہ دہلی کے دوران

۲۶۹۶ روپے سالانہ جمع کی ایک جاگیر جس میں سے ۱۲۵۲ روپے کی رقم دوامی عطیہ ہے
اور بقیہ صرف تاحیات تمھیں مرحمت کی جا چکی ہے، اب مذکورہ بالا کارگزاریوں کے پیش نظر
برائے منظوری مزید انعام ہز آنر لفٹیننٹ گورنر بہادر پنجاب کی سفارش پر اس کی بجائے
مذکورہ کل جاگیر تمھیں دوامی طور پر عطا کی جاتی ہے، اس عطیہ کے بدلے تمھیں سرکار برطانیہ
کے ساتھ اپنی خیر خواہی کا ہمیشہ ثبوت دینا چاہیئے

چٹھی تحریر کردہ منشی رجب علی بنام مسٹر ملٹن سابق کمشنر دہلی (بحوالہ فائل مذکورہ ورق ۸۳)

دریائے علم را گوہر نایاب و سپہر اقبال
را آفتاب جہانتاب، مرجع علما و فضلا
منجرین طرز قصیات السبق حکما، دوربین جناب معلی القاب دام اقبالہم، خدمت با خلعت می شناید
کہ از تحریر شفقت سید عبداللہ توجہات و التفاتہ و عنایات آنجناب نسبت خود دریافتہ سجدۂ شکر
بہ بارگاہ باری ادا کردم کہ مین ذرہ بے قدر را بنگاہ منظور ہنگام دوری فرد زہی خود و بدیار فسیح الفضا

[1] فائل مذکورہ، ورق ۷۷۵

لندن فراموش نہ فرمودہ اند، بلکہ برائے فلاح وبہبود بندہ باوجود کثرت مشاغل توجہ دارند تحقیق
این ست کہ خدمات ایں ذرہ بے قدر از عہد فرمان فرمائے کشور عدل و انصاف و مروت و
دانش و فتوت وعلم وفضل سرجارج رسل کلارک صاحب بہادر دام اقبالہم در ملک
محفوظ ایں روے دریائے ستلج وکوہستان ولاہور وحاضر بودن بحضور آنجناب درعہد کرنیل
سر ہنری منگمری لارنس صاحب بہادر بمقدمہ تحقیقات جرم مولراج ناظم ملتان و در
مفسدہ ۱۸۵۷ء موجود بودن در عین کارزار بمقابلہ اضراب اتواپ آتش بار درآوردن
بادشاہ کوتاہ اندیش دہلی بحضور صاحبان افواج ظفر امواج ومقابلہ بودن بسیف وسنان
وبجروحی پنج سوار ہمراہی خود ماموری شدن بحکم ویسرائے گورنر جنرل حال بنابر بدو وہی نتیس
پیشرک صاحب بہادر در مقدمہ ڈیسمبر وغیرہ حالات کہ از دفتر گورنرے ولاہور و
انبالہ ودہلی ظاہر وخطوط انگریزی صاحبان عالی شان برآں شاہد صادق والحمدللہ
کہ دریں وقت حضور سر جارج رسل کلارک صاحب بہادر وسر فریدرک کری بارنٹ صاحب
بہادر ومانسل صاحب بہادر وخصوص آنجناب رفیع الالقاب بدربار دربار ملکہ مقدرہ
انگلستان خلد اللہ ملکہا وسلطانہا موجود اند وعندالاستفسار ہرچہ واقعی است بنظر انصاف
از شرح وبسط آں دریغ نخواہند فرمود، پس مقام غور است کہ اقرارے کہ بابت عطائے
کل جاگیر موروثی بندہ براڈورڈ صاحب بہادر کردند وسر فریدرک کری بارنٹ صاحب
بہادر کہ اگر در معرکہ سنگھان لاہور ثابت قدمی وتدابیر مستحکمہ نمی فرمودند، تمام کشور پنجاب
از دست سرکار انگریزی بدر می رفت وشورشے عظیم برپا می شد، تصدیق خود براقرار براڈورڈ
صاحب بہادر نگاشتہ ومن بجی خود نرسیدم در دفتر انگریزی حالش واضح است، ودراں
وقت رازہا واسرارہا کہ صاحب ممدوح سپرد بندہ کردند تا امروز ہم بر زبان نیاوردہ



وصاحب ممدوح در خط انگریزی خود اشارہ بآں کردہ اند ونزد وم موجود وبے شک صاحب
ممدوح الصدر عندالاستفسار خود بیان خواہد فرمود، ہرگاہ چنیں صاحبان عالی شان
مربی خود وگواہ خود دارم، واز قاف تا قاف عدالت سرکار انگلشی مشہور است دلِ
خاکسار چرا در تصور ایں امور پاش پاش نگردد، ودیدۂ جیحوں وجگر خون چگونہ نشود،
مرافعہ برائے ایں نہ کردم کہ عمر نوح وخزانۂ قارون وگریہ ایوب وصبر یعقوب از کجا
پیدا کنم، دنیائے دنی را گاہے بنظر نیاوردہ ام، ہرچہ بدست آمد در بنائے مساجد
وچاہات فی سبیل اللہ وخیرات براہ خدا صرف کردم، ایں امر از غایت شہرت محتاج
بہ دلیل نیست، پس اگر بسعی آنجناب اندک نظر توجہ وزیر اعظم کشور انگلستان بحالم شود
بمقصود خود خواہم رسید ورنہ بقول شاعر

ع۔ زبانِ شکوہ نہ داریم ودستِ دامن گیر

داستانِ بندہ دراز است، زیادہ ازیں طول نہ کردم کہ موجب ملال مزاج ہمایوں
نگردد، مختصر این است کہ قبل ازیں ہم خدمات سرکار بجانفشانی کردہ ام، وایں
وقت عمرم زیادہ از شصت سال است، تا زندہ ام بجان حاضرم ودعائے ترقی
ملک ودولت سرکار سپہر اقتدار انگلشی وصاحبان قدر افزا وعنایت فرمائے خود می کنم
قلم شکستم ومضمون مختصر کردم، کہ نیست طرز ادب گفتگوے طولانی، آفتاب اقبال
تابان باد۔

سید رجب علی عفی عنہ

معروضہ ۲۲ ستمبر ۱۸۶۷ء

بمقام جگراؤں ضلع لودیانہ

مہر

# سیرت نبویؐ کے قدیم و اولین مآخذ
## اور
## ان کا تنقیدی جائزہ
## تصحیح و استدراک

از جناب محمد اجمل اصلاحی ندوی ایم، اے علیگ، مدیر معاون مجلہ ثقافۃ الہند نئی دہلی

جون کے معارف میں ڈاکٹر تقی الدین ندوی کا مقالہ "سیرت نبویؐ کے قدیم و اولین مآخذ اور ان کا تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، مقالہ پر از معلومات ہے لیکن تنقیدی جائزہ میں مزید تفصیل کی ضرورت تھی ذیل میں اس مقالہ کی بعض اہم فروگذاشتوں اور کوتاہیوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔

(الف) سیرت ابن اسحٰق کے بارے میں فاضل مقالہ نگار رقمطراز ہیں:۔

"ابن ہشام نے اس کی تہذیب و تلخیص کر کے اس نہر بند مشک کی خوشبو کو وقف عام کیا، اور آج وہی ذوق شناسان علم کی توجہات کا مرکز ہے، لیکن ابن ہشام نے سیرت ابن اسحٰق کو زیاد البکائی اور یونس بن بکیر سے حاصل کیا ہے، جن کے بارے میں محدثین کی رائیں کچھ زیادہ اچھی نہیں ہیں۔" (ص ۴۶۱)

معلوم نہیں فاضل مقالہ نگار سے یہ چوک کیسے ہوگئی، ابن ہشام نے سیرت ابن اسحٰق صرف زیاد البکائی سے حاصل کی ہے، پوری سیرت میں یونس بن بکیر سے ایک روایت بھی منقول نہیں ہے۔



ممکن ہے ابن ہشام کی سندوں میں یونس کے نام سے یہ اشتباہ پیدا ہوا ہو، لیکن یہ یونس بن بکیر نہیں ہیں، بلکہ ابن ہشام کے شیخ یونس بن حبیب نحوی (متوفی ۱۸۳ھ) مراد ہیں، ابن ہشام نے متعدد مقامات پر "یونس النحوی" نسبت کے ساتھ لکھا ہے[1] ابن ہشام کے تذکرہ میں فاضل مقالہ نگار نے خود لکھا ہے کہ "زیاد البکائی کے ارشد تلامذہ میں تھے، اور ان ہی کی روایت سے مغازی ابن اسحٰق کی سماعت و تحصیل کی تھی"۔ (ص ۴۶۴)

(ب) سیرت ابن ہشام کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مصطفی السقا اور عبدالسلام ہارون کی تحقیق و تہذیب کے ساتھ ۱۹۶۴ء میں اسکا ایک نہایت عمدہ اڈیشن طبع ہوا"۔ (ص ۴۶۴)

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیرت ابن ہشام کا ایک نہایت عمدہ اڈیشن ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا جس کی تحقیق و تہذیب کا کام مصطفی السقا اور عبدالسلام ہارون کے اشتراک سے انجام پایا، حالانکہ اس طرح کا کوئی اڈیشن اب تک منظر عام پر نہیں آیا، اصل میں فاضل مقالہ نگار نے سیرت ابن ہشام کے دو اڈیشنوں کو خلط ملط کر دیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ سیرت ابن ہشام کا ایک محقق اڈیشن تین صاحبان مصطفی السقا، ابراہیم الابیاری اور عبدالحفیظ شلبی نے تیار کیا تھا جو پہلی بار ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء میں مطبعہ مصطفی البابی الحلبی و اولادہ بمصر سے شائع ہوا تھا، پھر دوبارہ ۱۳۷۵ھ مطابق ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔

عالم عرب کے ممتاز محقق عبدالسلام ہارون نے تہذیب سیرۃ ابن ہشام کے عنوان سے سیرت ابن ہشام کی تلخیص و تہذیب کی تھی جس کا دوسرا اڈیشن ۱۹۶۴ء میں المؤسسۃ العربیۃ الحدیثۃ قاہرہ سے

[1] ملاحظہ ہو سیرت ابن ہشام تحقیق مصطفی السقا وغیرہ طبع دوم ۱۳۷۵ھ، ۱: ۱۰، ۹۰، ۱: ۵۳۸ (حدثنی یونس بن حبیب النحوی) ۲: ۴۸۴ (انشدنی یونس النحوی)

شائع ہوا تھا۔

(ج) کتب مغازی کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ "ذیل میں ہم ان اکابرین امت کے نام اور ان کی تصنیفات کی ایک جامع فہرست درج کرتے ہیں، جو فن سیر کے ارکان و اساطین شمار ہوتے ہیں" (ص ۴۴۵)، اس کے بعد اٹھائیس (۲۸) علمائے مغازی کا تذکرہ کیا ہے، اس جامع فہرست سے بہت سے مشہور علمائے مغازی کے نام غائب ہیں، جن کی معلومات یا تصنیفات کو اس موضوع پر اہم ماخذ کی حیثیت حاصل رہی ہے، اور انھیں کسی حال میں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، مثال کے طور پر یہاں چند ناموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ ابان بن عثمان بن عفانؓ (متوفی ۱۰۵ھ) خلیفہ سوم حضرت عثمان بن عفانؓ کے صاحبزادے تھے، ۳۶ھ میں قصاص عثمانؓ کی مہم میں حضرت عائشہؓ کے ساتھ شریک تھے، اس لئے جوزف ہورووتس کا خیال ہے کہ ان کی پیدائش کسی طرح ۲۰ھ سے بعد کی نہیں ہو سکتی، مدینہ کے فقہائے عشرہ میں انکا شمار ہوتا تھا، ۷۵ھ سے ۸۲ھ تک سات سال مدینہ کے گورنر رہے، عبدالملک بن مروان نے معزول کیا، ان کے انتقال کے بارے میں کئی روایتیں ہیں، امام بخاری نے التاریخ الکبیر میں ولید کے عہد (۸۶-۹۶ھ) میں وفات لکھی ہے، جب کہ ابن سعد نے یزید ثانی (۱۰۱-۱۰۵ھ) کا زمانہ لکھا ہے۔[1]

ابن سعد نے مغیرہ بن عبدالرحمن بن الحارث بن ہشام بن المغیرہ کے بارے میں واقدی کی روایت نقل کی ہے کہ "مغیرہ ثقہ تھے لیکن کم احادیث کی روایت کی البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مغازی انھوں نے ابان بن عثمان سے اخذ کئے تھے، وہ ان کے سامنے اکثر پڑھے جاتے تھے، اور وہ ہمیں انکی

[1] سیرت نبوی کی ابتدائی کتابیں اور ان کے مؤلفین، مصنفہ پروفیسر جوزف ہورووتس ترجمہ نثار احمد فاروقی ادارۂ ادبیات دلی، ۱۹۸۳ء، ۱۱-۱۴، طبقات ابن سعد، بریل ۵/۱۱۲-۱۱۳۔



تعلیم کا حکم دیتے تھے۔ مغیرہ بن عبدالرحمن ابن اسحٰق اور ان کے والد اسحٰق بن یسار کے علاوہ امام مالک کے بھی شیخ ہیں، اور ثقہ ہیں۔[2] ابن سعد نے اہل مدینہ کے طبقہ تابعین میں ان کا ذکر کیا ہے۔

۲۔ شرحبیل بن سعد (متوفی ۱۲۳ھ) سفیان بن عیینہ کا قول ہے کہ مغازی اور اصحاب بدر کا ان سے بڑا عالم کوئی نہ تھا۔[3] شرحبیل نے غزوۂ بدر اور غزوۂ احد میں شریک ہونے والوں نیز مہاجرین حبشہ اور مہاجرین مدینہ کی فہرست مرتب کی تھی، آخر عمر میں افلاس کا شکار ہو گئے جس کی وجہ سے بعض لوگوں نے ان کے مغازی کو ساقط الاعتبار قرار دیا، لیکن موسیٰ بن عقبہ نے جو خود ثقہ اور فن مغازی کے سرخیل ہیں شرحبیل بن سعد کی مدافعت کی ہے۔[4]

۳۔ عبداللہ بن محمد بن ابی بکر بن حزم (متوفی ۱۳۵ھ) ابن اسحٰق کے اہم شیوخ میں سے ہیں مغازی کے ماہر تھے، ان کی روایات ابن اسحٰق، واقدی، ابن سعد اور طبری کا ماخذ ہیں، وفود، ارتداد اور بعض تحریری دستاویزوں کے سلسلہ میں ان کی روایتیں خاص طور سے آتی ہیں، عبداللہ بن ابی بکر کے ایک بھتیجے عبدالملک بن محمد بن ابی بکر کے بارے میں خطیب بغدادی نے مریح بن النعمان کا قول نقل کیا ہے کہ ہم نے عبدالملک سے سن کر مغازی قلمبند کی جو انھوں نے اپنے چچا عبداللہ بن ابی بکر سے حاصل کی تھی۔[5] واقدی نے بہت سی روایات عبدالملک کے دوسرے بھائی عبدالرحمن کے واسطے سے نقل کی ہیں، محدثین نے عبداللہ بن ابی بکر بن حزم کی توثیق کی ہے، امام مالکؒ کا قول ہے کہ وہ اصحاب علم اور اہل بصیرت میں سے تھے، امام نسائی نے "ثقہ ثبت" لکھا ہے۔[6]

[2] طبقات ابن سعد، دار صادر بیروت ۵/۲۱۰ [3] میزان الاعتدال طبعۃ الخانجی ۱۹۳/۳۔ تہذیب ۱۰/۲۲۵ [4] تہذیب ۴/۳۲۱ [5] تہذیب ۱/۱۶۳ نیز ملاحظہ ہو جوزف ہورووتس: ۲۲-۲۳ [6] تاریخ بغداد طبع الخانجی ۱۹۳۱ء ۱۰/۴۰۹ [7] تہذیب ۵/۱۶۴، نیز دیکھئے جوزف ہورووتس: ۵۳-۵۸

۴ - ابوالاسود محمد بن عبدالرحمٰن بن نوفل (متوفی ۱۳۱ھ یا ۱۳۷ھ) عروہ بن الزبیر علی بن حسین اور سلیمان بن یسار وغیرہ سے روایت کی۔ امام زہری کے معاصر اور ان کے شیخ بھی ہیں۔ ان کے علاوہ ابن اسحٰق، امام مالک اور امام لیث کے بھی شیخ ہیں، امام نسائی اور ابوحاتم نے ثقہ قرار دیا ہے۔[1] فیوک نے مغازی پر ان کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے۔[2]

۵ - عبدالملک بن محمد بن ابی بکر بن حزم (متوفی ۱۷۶ھ) عبداللہ بن ابی بکر بن حزم کے تذکرہ میں ان کا ذکر گذر چکا ہے، ہارون رشید کے عہد میں بغداد میں قاضی تھے اور وہیں انتقال کیا، خطیب نے لکھا ہے کہ جلیل القدر عالم، سیرت و حدیث کے ماہر اور ثقہ تھے ابن ندیم نے سن وفات ۱۷۶ھ لکھا ہے لیکن ان کے شاگرد سریج بن نعمان جوہری کا بیان ہے کہ ان کا انتقال ۱۷۴ھ میں ہوا، سریج خود جنازہ میں شریک تھے،[3] ابن ندیم نے فن مغازی پر عبدالملک بن محمد کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے۔ (وله من الكتب كتاب المغازي)[4]

۶ - علی بن مجاہد کابلی (متوفی ۱۸۰ھ) ابن الکابلی کے نام سے مشہور ہیں، ابومعشر سندی موسیٰ بن عبیدہ ربذی، ابن اسحٰق، یونس بن ابی اسحٰق اور سفیان ثوری وغیرہ کے شاگرد ہیں، علی بن مجاہد سے سماعت کرنے والوں میں جریر بن عبدالحمید، محمد بن عیسیٰ بن صباغ، صلت بن مسعود کے علاوہ امام احمد بن حنبل بھی ہیں، امام احمد ابن حنبل نے ۱۸۲ھ میں ان سے سماعت کی، یحییٰ بن ضریس اور احمد بن جعفر جمال انھیں جھوٹا قرار دیتے ہیں لیکن امام ترمذی نے انھیں ثقہ قرار دیا ہے، ابن حنبل فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے روایتیں درج کی ہیں، اور میں کوئی حرج نہیں سمجھتا، (كتبت عنه ما أرى به بأسا) ابن کابلی نے فن مغازی پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔[5]

---

[1] تہذیب ۹، ۳۰۷ - ۳۰۸ [2] انگریزی ترجمہ سیرت ابن ہشام (لائف آف محمد) از گلیوم مطبوعہ ۱۹۵۵ء صفحہ ۱۷۔
[3] تاریخ بغداد ۱۰ - ۴۰۸ - ۴۰۹ [4] فہرست مطبعہ رحمانیہ مصر ۳۱۵ [5] تاریخ بغداد ۱۲ - ۳۴ تہذیب ۷ - ۳۷۸ - ۳۷۹
سمعانی گب میموریل لندن ۱۹۱۲ء ورق ۴۶۹۔



۷ - ابان بن عثمان بجلی، احمر بجلی کے لقب سے مشہور تھے، یاقوت نے ابوجعفر طوسی کی کتاب اخبار مصنفی الامامیہ کے حوالہ سے ان کے حالات لکھے ہیں، کوفہ کے رہنے والے تھے، شعراء کے حالات انساب اور ایام عرب کے ماہر تھے، ان موضوعات پر ابوعبیدہ معمر بن المثنیٰ اور محمد بن سلام جمحی نے ان سے کثرت سے روایتیں نقل کی ہیں، ابان بن عثمان بجلی کی ایک ہی تصنیف معروف ہے جس میں انھوں نے مبدأ، مبعث، مغازی، وفات، سقیفہ اور ردہ" کے واقعات جمع کئے تھے،[1] میزان الاعتدال میں ذہبی نے لکھا ہے کہ احمر بجلی ابان بن تغلب کے شاگرد تھے۔ ان کے بارے میں کلام کیا گیا ہے لیکن بالکلیہ متروک نہیں ہیں، (تكلم فيه ولم يترك بالكلية)[2] ابان بن تغلب بھی شیعہ عالم لغوی اور نحوی تھے ابن عیینہ، حماد بن زید اور ہارون بن موسیٰ وغیرہ نے ان سے حدیث کی سماعت کی ۱۴۱ھ میں انتقال ہوا۔[3]

ابوعبیدہ معمر بن مثنیٰ (۱۱۰ - ۲۰۹ھ) ابن ہشام کے اہم شیوخ میں سے ہیں، سیرت ابن ہشام میں اشعار و انساب اور تاریخ کے علاوہ مغازی کی روایتیں بھی ابوعبیدہ سے منقول ہیں اس سے ابان بن عثمان بجلی کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے،

۸ - ابوالحسن مدائنی (۱۳۵ - ۲۲۵ھ) علی بن محمد بن عبداللہ بن ابی سیف المدائنی[4] کی علمی زندگی کا آغاز محدث کی حیثیت سے ہوا لیکن جلد ہی انھوں نے اپنی توجہ تاریخ و تذکرہ اور انساب و اشعار پر مرکوز کر دی تذکرہ نگاروں نے "الاخباری صاحب التصانیف والمغازی، والانساب" کے الفاظ سے ان کا تعارف کرایا ہے، خطیب بغدادی نے لکھا ہے۔

وكان عالما بايام الناس واخبار العرب وأنسابهم، عالما بالفتوح

---

[1] معجم الادباء (رفاعی) ۱ - ۱۰۹ بغیۃ الوعاۃ طبع الخانجی مصر ۱۳۲۶ھ ۱۷۷، طبقات فحول الشعراء شرح محمود محمد شاکر، دارالمعارف مصر، اشاریہ ۷۰۱ [2] میزان الاعتدال ۱ - ۹۸ [3] معجم الادباء ۱ - ۱۰۸ البغیۃ الوعاۃ ۱۷۶
[4] ابوالحسن مدائنی پر ایک مفصل مقالہ قاضی اطہر مبارکپوری کے قلم سے دو قسطوں میں، فروری و مارچ ۱۹۸۳ء کے معارف میں شائع ہو چکا ہے۔

والمغازی ورِوایۃ الشعر صدوقا فی ذٰلک [۴۴]

مدائنی کے شیوخ میں موسیٰ بن عقبہ (متوفی ۱۴۱ھ) اور ابومعشر سندی (متوفی ۱۷۰ھ) جیسے ائمہ مغازی اور ابوالیقظان (متوفی ۱۹۰ھ) جیسے عالم انساب شامل ہیں، شاگردوں میں مشہور مورخ ابوبکر احمد بن ابی خیثمہ بغدادی (متوفی ۲۹۹ھ) صاحب التاریخ الکبیر اور ماہر انساب زبیر بن بکار (متوفی ۲۵۶ھ) صاحب انساب قریش اور احمد بن الحارث الخزاز (متوفی ۲۵۸ھ) قابل ذکر ہیں۔

یاقوت نے ابن ندیم کی کتاب سے مدائنی کی تصنیفات کی فہرست نقل کی ہے، جس میں کتب فی اخبار النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کے عنوان سے سیرت کے موضوع پر مدائنی کے تیس [۳۰] رسائل کا ذکر ہے [۴۵]، تین کتابوں کتاب عہود النبی صلی اللہ علیہ وسلم، کتاب خطب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، کتاب سرایا رسول اللہ علیہ وسلم کے نام مکرر ہو گئے ہیں، ان مکررناموں اور کتاب حجۃ ابی بکر رضی اللہ عنہ کو اس فہرست سے خارج کر دیا جائے تو چھبیس [۲۶] کتابیں ہوتی ہیں جو درج ذیل ہیں۔

کتاب امہات النبیؐ، کتاب صفۃ النبیؐ، کتاب اخبار المنافقین، کتاب عہود النبیؐ کتاب تسمیۃ المنافقین ومن نزل فیہ القرآن منہم ومن غیرھم، کتاب تسمیۃ الذین یؤذون النبیؐ وتسمیۃ المستھزئین، کتاب رسائل النبیؐ، کتاب کتب النبیؐ الی الملوک، کتاب آیات النبیؐ، کتاب اقطاع النبیؐ، کتاب فتوح النبیؐ، کتاب صلح النبیؐ، کتاب خطب النبیؐ، کتاب المغازی، کتاب السرایا، کتاب الوفود (اس میں وفود یمن، وفود مضر اور وفود ربیعہ کا تذکرہ ہے) کتاب دعاء النبیؐ، کتاب خبر الافک، کتاب ازواج النبیؐ، کتاب عمال النبیؐ علی الصدقات، کتاب ما نُھی عنہ رسول اللہ صلعم، کتاب اخبار النبیؐ

[۴۴] تاریخ بغداد ۱۲: ۵۵ [۴۵] نیز سمعانی، ورق ۵۰۵ [۴۶] معجم الادباء ۱۲: ۱۲۹-۱۳۱



کتاب الخاتم والرسل، کتاب من کتب لہ النبیؐ کتابا وامانا، کتاب اموال النبیؐ، و کتاب من کان یکرہ وعلیہ الصدقۃ من العرب [۴۷]۔

ابن عدی کے نزدیک مدائنی حدیث میں قوی نہیں ہیں، لیکن ابن معین وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے [۴۸]۔

۹۔ ابوجعفر الخزاز (متوفی ۲۵۸ھ)۔ ابوجعفر احمد بن الحارث بن المبارک الخزاز مدائنی کے شاگرد رشید اور "صاحب المدائنی" کے لقب سے مشہور تھے، کثرت سے روایتیں بیان کیں، ثقہ تھے ابن ندیم نے مغازی پر ان کی کتاب "مغازی النبیؐ وسرایاہ وذکر ازواجہٗ" کے عنوان سے ذکر کی ہے [۴۹]، یہ کتاب بظاہر مدائنی ہی کی روایات پر مشتمل رہی ہوگی، خطیب بغدادی نے لکھا ہے، کہ خزاز صاحب علم وفہم وصدوق تھے، مدائنی سے ان کی ساری تصنیفات کی روایت کی، ابوسعید سکری، اور ابوبکر ابن ابی الدنیا وغیرہ نے ان سے روایت کی، ابن قانع کا بیان ہے کہ ۲۵۸ھ میں بغداد میں انتقال کیا، ایک قول ۲۵۹ھ کا بھی ہے [۵۰]،

۱۰۔ ابراہیم بن ہلال ثقفی (متوفی ۲۸۳ھ) طوسی نے امامیہ کے مصنفین میں ان کا تذکرہ کیا ہے، اصفہان میں سکونت پذیر تھے، یاقوت نے ابراہیم کی تصنیفات میں کتاب المغازی کا بھی ذکر کیا ہے [۵۱]۔

(د) سیرت پر متاخرین کی تصنیفات کے عنوان سے فاضل مقالہ نگار نے سات کتابوں کا ذکر کیا ہے، اس فہرست میں درج ذیل کتابوں کا نام نہیں ہے حالانکہ سیرت نگاری کی تاریخ میں انھیں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے،

[۴۷] فہرست ابن ندیم کا جو اڈیشن ہمارے پیش نظر ہے، اس میں دو رسائل فتوح النبیؐ اور اخبار النبیؐ کا ذکر نہیں ہے، [۴۸] میزان الاعتدال ۳-۱۵۳ [۴۹] فہرست: ۱۵۲ [۵۰] تاریخ بغداد ۴-۱۲۲ معجم الادباء ۳: ۷-۸ [۵۱] معجم الادباء ۱: ۲۳۳

۱۔ الدرر فی اختصار المغازی والسیر۔ حافظ ابن عبدالبر (۳۶۸ - ۴۶۳ ھ) کی تصنیف، ابن حزم کی جوامع السیرۃ اور ابن سید الناس کی عیون الاثر کا ماخذ ہے، ابن حزم کی بہت سی تحقیقات کا سہرا دراصل ابن عبدالبر کے سر ہے، ڈاکٹر شوقی ضیف کی تحقیق سے المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ قاہرہ نے ۱۳۸۶ھ مطابق ۱۹۶۶ء میں شائع کیا تھا۔

۲۔ عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر۔ ابن سید الناس (متوفی ۷۳۴ھ) کی مشہور تصنیف ہے ۱۳۵۶ھ میں قاہرہ سے دو جلدوں میں شائع ہوئی۔

۳۔ السیرۃ النبویہ۔ شہاب الدین احمد بن اسمٰعیل الشیطی (متوفی ۸۳۵ھ) کی مبسوط تصنیف جو تقریباً تیس حصوں میں تھی۔[1]

۷۔ دلائل نبوت کی کتابوں کے سلسلہ میں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اس موضوع پر امام ابوالحسن ماوردی (متوفی ۴۵۰ھ) کی ایک کتاب "اعلام النبوۃ" ۱۹۰۱ء میں بغداد سے المطبعۃ البہیۃ سے شائع ہوئی تھی۔

---

[1] ایضاح المکنون ۲-۴۳

# سیرۃ النبی حصہ اوّل

اس کے سات حصے ہیں، پہلے حصہ میں مولانا شبلی کے قلم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے لے کر فتح مکہ تک کے حالات و واقعات اور غزوات کا ذکر اور پھر غزوات پر تبصرہ ہے اس کے مقدمہ میں سیرت نبوی کے قدیم اور اردو ماخذ پر مولانا ہی کے معجز نگار قلم سے بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے جس کا اضافہ شکل ہے۔

"منیجر"

قیمت :- ۰۰-۲۶



# پیرس سے ایک مکتوب گرامی

جولائی ۱۹۸۱ء کے معارف کے صفحہ ۱۷ و ۱۸ پر کتابت کی غلطی کی وجہ سے حضرت "عبداللہ بن عمروؓ" کے بجائے عبداللہ بن عمرؓ چھپ گیا ہے، ہم جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اس غلطی کی طرف حسب ذیل مکتوب لکھکر توجہ دلائی، اس میں اور بھی ایک مفید بات لکھی ہے جو امید ہے کہ ناظرین کے لئے باعث دلچسپی ہوگی۔"

پیرس، ۲۶ رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ

محترمی زاد مجدکم

سلام مسنون :- عید مبارک

ابھی ابھی جولائی کا معارف پہنچا، ممنون ہوا،

اس کے صفحہ ۱۷ - ۱۸ "میں عبداللہ بن عمرؓ" غلط ہے، یہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ ہیں، مرحوم شاہ معین الدین احمد صاحب نے یہ غلطی نہیں کی ہوگی،

مرحوم کے بیان پر کہ "بے شک ابتدا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت حدیث کی ممانعت کی تھی،" فاضل معاصر محمد مصطفےٰ الاعظمی کی یہ تحقیق ناظرین کی خدمت میں پیش کئے جانے کے قابل ہے کہ ممانعت کا حکم رسول اکرمؐ سے "صحیح حدیثوں" میں کہیں ثابت نہیں، صرف ایک حدیث

حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ کی ہے، جو صحیح مسلم میں داخل ہوگئی ہے، لیکن ابن حجرؒ نے فتح الباری میں بیان کیا ہے، کہ امام بخاریؒ نے اسے بھی رد کر دیا، اور خیال ظاہر کیا کہ یہ حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ کی ذاتی رائے جو کسی غلطی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہوگئی ہے،

اس خبر سے بھی مسرت ہوئی کہ سیرت شامی چھپ رہی ہے، خدا جلد مکمل کرائے،

نیاز مند

محمد حمید اللہ

---

## سلسلۂ سیر الصحابہ

سیرۃ النبیؐ کے مقدس سلسلہ کے بعد، سیر الصحابہؓ کا بھی ایک سلسلہ یہاں کے مختلف مصنفین و رفقار سے تیار کرایا گیا ہے، جو گیارہ جلدوں پر مشتمل ہے، جن میں تین جلدیں مع خلفائے راشدین رضی اللہ تعالےٰ عنہم کے مہاجرین پر ہیں، اور دو جلدیں انصار کرام پر ہیں، اور ایک پوری جلد ازواج مطہرات، بنات طاہرات، اور دوسری صحابیات قانتات پر ہے، تین جلدیں صحابہ و صحابیاتؓ کے عقائد، عبادات، اخلاق، معاشرت اور صحابہ کے سیاسی، انتظامی، اور علمی کارناموں پر ہے، [illegible] صحابۂ کرام کے حصہ میں زندگی کا پورا مرقع آگیا ہے، اسی کی ایک جلد میں حضرت عمرو بن العاص فاتح مصر کے صاحبزادے حضرت عبد اللہ بن عمروؓ بن العاص کا تذکرہ بھی ہے، جو اسلام کے ایک متبحر عالم اور بڑے ہی عبادت گذار تھے، اور حدیثوں میں ان کے بڑے فضائل آئے ہیں،

قیمت پورے سٹ کی ۔۔۔ ۱۹۱

"منیجر"



# ادبیات

## غزل

از ڈاکٹر سید طفیل احمد مدنی، الہ آباد

یہ فضا عجب فضا ہے، یہ چمن عجب چمن ہے
نہ کہیں ہے شمع روشن نہ کہیں کوئی کرن ہے

کہیں درد و کرب و غم ہے تو کہیں بڑی گھٹن ہے
میں کہوں تو کس زباں سے کہ یہی مرا وطن ہے

کوئی کس طرح سے آخر کرے جرأتِ محبت
کہ مزاجِ عہدِ حاضر بڑا تند و صف شکن ہے

کسی غیر کا گذر ہی ہے کہاں ترے علاوہ
یہ ہے خاص تیری منزل یہ دلوں کی انجمن ہے

مرے دوستوں کو مجھ سے ہے یہی تو بس شکایت
مرے جام میں ابھی تک وہی بادۂ کہن ہے

یہ بتانِ عہدِ حاضر تو ہیں لائقِ پرستش
مگر اس کو کیا کروں میں مرا دل ہی بت شکن ہے

نہ بدل سکا زمانہ مری خوئے عاشقی کو
جو لباس پیشتر تھا وہی اب بھی پیرہن ہے

ہو نصیب ہم کو کیسے اے طفیلؔ سربلندی
نہ متاعِ دین و ایماں نہ متاعِ علم و فن ہے

---

## غزل

از جناب بسنت کمار بسنت، ایڈوکیٹ لکھنؤ

یہ چمن یہ سبزہ و برگ و گل یہ مہکتی شام حسین حسیں
یہ نسیم و نکہتِ جانفزا کہیں پاس ہے کوئی مہ جبیں

غمِ کائنات نہ پاس آ، غمِ زندگی نہ ستا مجھے ذرا
میں پیامبر ہوں نشاط کا مری راہ میں نہیں غم کہیں

یہ جبیں پہ ان کے پڑی شکن کہ فلک سے پھوٹی کوئی کرن
یہ جمالِ حسن، یہ بانکپن لبِ سرخ و عارضِ آتشیں

مرا آشیاں ہے کہ کہکشاں کوئی دشت ہے کہ گلستاں
یہ ہجومِ حسن، یہ گلِ خاں، یہ شمیم نرگس و یاسمیں

مجھے فکر کچھ نہیں ہمسری کی میں ہوں بے نیاز غم و خوشی
مرے لب پہ نغمۂ سرمدی ترے در پہ خم ہے مری جبیں

نہ طواف دیر و حرم میں کچھ، نہ صنم کدے میں نہ خم میں کچھ
نہیں ہم میں کچھ نہیں تم میں کچھ کسی کو کسی کی خبر نہیں

ہے عجیب عالم ہمسفر ہیں دماغ و دل تو ادھر ادھر
نہیں راہ میں کوئی راہبر نہ انہیں کوئی نہ ہم نشیں

تری کائنات ہے کہکشاں ہمہ شہر تیرا ترا جہاں
تری ذات و نام ہیں جاوداں تہِ فلک [illegible]

جو فسردہ گل تھا کھلا دیا جہاں چاہا خون گرا دیا
جو بہار آئی تو کب رہا ہمیں ہوش دامن و آستیں

لئے میں پیام بہار کا جو سبک سوئے چمن گیا
کھلے پھول سبزہ نکھر گیا نہ رہی چمن میں خزاں کہیں

## غزل

از جناب وارث ریاضی صاحب چمپارن

بستیوں میں وہ چلے آئے ہیں ویرانوں سے
ہو گیا عشق بھی سوا ترے دیوانوں سے

وہ تجھے عشرت کدۂ حسن میں جلوہ افروز
ہم رہِ عشق میں لڑتے رہے طوفانوں سے

دیکھ یہ معجزۂ تشنہ لبی اے ساقی
مے ابلنے لگی ٹوٹے ہوئے پیمانوں سے

عشق کی راہ میں آئے ہیں مقام ایسے بھی
راز کی بات بھی کہنا پڑی بیگانوں سے

سوزِ دل، سوزِ جگر، سوزِ محبت کے سوا
چاہیے کیا انھیں ہم سوختہ سامانوں سے

وہ تو ہر حال میں مائل بہ کرم ہیں لیکن
ہم تو جیتے ہیں غمِ عشق کے افسانوں سے

چاکِ دامن سے جو مل جاتی ہے فرصت اُن کو
تیرے دیوانے الجھتے ہیں گریبانوں سے

کیجیے آپ کوئی طرزِ جفا اب ایجاد
دلِ بیتاب بہلتا نہیں احسانوں سے

حسنِ تدبیر سے جاگ اٹھتا ہے قوموں کا نصیب
کبھی تقدیر بدلتی نہیں ارمانوں سے

کام آئے گا کوئی وقت مصیبت وارث
یہ توقع ہی نہیں آج کے انسانوں سے



# مطبوعات جدیدہ

**عیون العرفان فی علوم القرآن** مرتبہ مولانا قاضی مظہر الدین احمد بلگرامی، تقطیع متوسط کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۲۴ مجلد مع خوبصورت گردپوش، قیمت ۱۵ روپیے پتے، (۱) ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ (۲) کتب خانہ اعزازیہ، دیوبند، ضلع سہارنپور یوپی،

قرآن مجید کی جمع و تدوین پر اردو میں بہت کام ہوا ہے، لیکن اسباب النزول اور محکم و متشابہ پر کم لکھا گیا ہے، مولانا قاضی مظہر الدین سابق صدر شعبہ سنی دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اس کتاب میں ان تینوں مباحث پر گفتگو کی ہے، اول الذکر مبحث میں جمع و ترتیب کے سلسلہ کی ضروری بحثوں کے علاوہ خاص طور پر عہد رسالت، عہد صدیقی اور عہد عثمانی میں قرآن کی جمع و ترتیب کی نوعیت واضح کی ہے اور قرآن کی سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کے توقیفی یا عدم توقیفی ہونے کا ذکر کیا ہے، دوسرے باب میں شان نزول کا مطلب، اس کی اہمیت اس کے فائدے اور قرآن کے تدریجاً نازل کیے جانے کی حکمت بتائی ہے، تیسرے باب میں محکم و متشابہ کے مفہوم و مراد کی وضاحت اور ان سے متعلق دوسرے امور پر بحث کی گئی ہے، غالباً عام قارئین کی رعایت سے آخر الذکر دونوں ابواب میں زیادہ تفصیل سے کام نہیں لیا گیا ہے، لائق مصنف احتیاط کی بنا پر عموماً ہر مبحث کے متعلق متقدمین کی رائیں پیش کر کے آگے بڑھ گئے ہیں لیکن اس کی وجہ سے بعض مسائل کے متعلق کوئی متعین اور خاص فیصلہ سامنے نہیں آسکا ہے، دو ایک جگہ حوالے بھی درج ہونے سے رہ گئے ہیں مثلاً ص ۴۴ پر لبید بن ربیعہ کے شعر گوئی چھوڑ دینے کا واقعہ بلا حوالہ درج ہے، اکثر حوالے ثانوی

ماخذ کے دیے گئے ہیں، عام اور اوسط درجہ کی استعداد رکھنے والوں کو اس کتاب سے قرآن کے بارہ میں بہت سی اچھی اور مفید باتیں معلوم ہوں گی،

**بنات اسلام کی دینی و علمی خدمات** مرتبہ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری تقطیع کلاں، کاغذ کتابت عمدہ صفحات ۹۶ قیمت دس روپیے پتہ۔ دائرہ ملیہ، مبارکپور۔ اعظم گڈھ۔

مردوں کی طرح مسلم خواتین کے دینی و علمی کارنامے بھی گوناگوں ہیں، اس کتاب میں ان کی کچھ جھلکیاں دکھائی گئی ہیں، یہ دو ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں امت کی عام خواتین کے شوق و جستجوے علم کا حال بیان کیا گیا ہے، اس میں خصوصیت سے حدیث کی طلب و تحصیل اور اس کے درس و تدریس میں ان کے کمالات دکھائے ہیں اور فقہ و تفسیر حفظ و تجوید، شعر و ادب، خطاطی و کتابت وعظ و ارشاد اور ہدایت و تذکیر میں بھی ان کے کاموں کا جائزہ لیا ہے، دوسرے باب میں علم و فضل اور فقہ و حدیث میں ان ممتاز متعدد خواتین کا تذکرہ ہے جو دور صحابہ میں تھیں، اس کتاب سے مسلمان خواتین کے دینی علوم کے مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات سامنے آجاتے ہیں، اس کا مطالعہ عورتوں کے لیے خاص طور پر مفید اور سبق آموز ہے،

**نمود ہستی** مرتبہ جناب سید محمد حسنین صاحب تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۰۰ قیمت ۲۲ روپیے، پتے (۱) بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (۲) کریسنٹ کوآپریٹیو پبلشنگ سوسائٹی لمیٹڈ گیا، ۸۲۳۰۰۱

یہ مجموعہ تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ "نقش" میں مندرجہ ذیل چار اشخاص کی سیرت و شخصیت کے خط و خال پیش کیے گئے ہیں، فخر الدین محمد شمسی، فخر الدین علی احمد سابق صدر جمہوریہ ہند، قاضی عبد الودود، پروفیسر فضل الرحمن، فخر الدین علی احمد صاحب کے علاوہ تینوں اشخاص کا تعلق صوبہ بہار سے ہے، فخر الدین صاحب کے ذکر میں غالب کے خاندان سے ان کے تعلق اور اپنی ان سے متعدد ملاقاتوں کا مفصل ذکر کیا ہے، اسی ضمن میں



اتر پردیش اردو اکاڈمی کے زیر اہتمام ۲ نومبر ۷۶ء کو منعقد اردو اکاڈمیوں کی کل ہند کانفرنس میں کی گئی ان کی ایک تقریر بھی نقل کی ہے، اس میں اس وقت کے یہاں موجود یو۔پی کے گورنر، وزیر اعلیٰ اور وزیر تعلیم وغیرہ کو آفسوں میں اردو میں درخواستیں نہ لینے اور ممبروں کو اسمبلی میں اردو بولنے کا موقع نہ دینے پر سرزنش کی تھی، فخر الدین محمد شمسی کی شخصیت علمی حیثیت سے زیادہ ممتاز نہ تھی تاہم وہ عمدہ سیرت و شخصیت کے مالک تھے، اور ان کے اصحاب علم و ادب سے مراسم و تعلقات بھی تھے، قاضی عبد الودود صاحب کی ذات تعارف سے مستغنی ہے، پروفیسر فضل الرحمن بہار کے لائق و فاضل شخص تھے لیکن انھوں نے کم عمر پائی اس لیے ان کی صلاحیتوں کے جوہر پوری طرح نہیں چمکے تاہم ایک پرنسپل اور معلم کی حیثیت سے ان کے کارنامے ان کے شاگردوں کو برابر یاد رہیں گے، جناب سید حسنین نے ان کے بہت سے دلچسپ اور موثر واقعات لکھے ہیں، مصنف نے ہر صاحب تذکرہ کی سیرت و شخصیت اور کمالات کا جوہر کھینچ دیا ہے اور ہر تذکرہ کے ضمن میں متعدد ایسے واقعات بھی بیان کیے ہیں جن سے گذشتہ عہد کی علمی، تعلیمی، تہذیبی اور سیاسی حالت بھی سامنے آجاتی ہے، مصنف نے جن اشخاص کے بارہ میں اپنے نقوش و تاثرات پیش کیے ہیں، وہ انکے ممدوح و محبوب ہیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے دوسرا رخ بھی پیش کرنے میں تامل نہیں کیا ہے، چنانچہ قاضی عبد الودود کے متعلق لکھتے ہیں قاضی صاحب حافظ قرآن ہیں، عربی داں اور انگریزی و فارسی زبان پر کامل دسترس رکھتے ہیں، انکی بصیرت اور فکر و نظر کا سوز و ساز مگر دل کو نصیب نہیں (ص ۹) عند التذکرہ انھوں نے اکثر اعتراف کیا کہ عالم وجود کے مسئلے پر وہ مبہوت ہو جاتے ہیں، اور حیات بعد الموت کی صداقت پر انھیں شبہ معلوم ہوتا ہے بلا جھجک وہ فرماتے ہیں کہ وہ اس لئے مسلمان ہیں کہ پیدائش اور تعلیم و تربیت ایسے خاندان میں ہوئی جو مذہب اسلام کے پیرو تھے ورنہ وہ صرف انسان ہیں، انسانیت کو وہ مذہب تصور کرتے ہیں، رب کو خدا سے موسوم نہیں کرتے، ایک لافانی عظیم توانائی سمجھتے ہیں، جو نظام کون و مکاں پر اٹل ضابطے کے ساتھ

تمادر ہے، وہ قانون داں ہیں، اور ولایت کے سند یافتہ بیرسٹر، مرئی اور غیر مرئی، ہر امر کے وجود و عدم کو قاضی صاحب اسی نقطۂ نظر سے سوچنے اور سمجھانے کے عادی ہیں معجزات اور وحی پر ان کا ایمان نہیں کشف و کرامت کو وہ خرافات سمجھتے ہیں، قاضی صاحب کا شمار صف اول کے محققین میں ہوتا ہے لیکن انکے تحقیقی کاموں سے بعض اہل نظر مطمئن نہیں ہیں، اس سلسلہ میں انکی تصنیف اشتر و سوزن پر ڈاکٹر خلیق انجم کا ایک دلچسپ تبصرہ ہماری زبان سے نقل کرنے کے بعد لائق مرتب لکھتے ہیں "قاضی صاحب کی تحقیقات لطف لینے کی نہیں انکی زبان و بیان اور تمکنگ پر آج بھی بھلے بازیاں کم نہیں" دوسرا حصہ "نقش" تصویروں سے مزین ہے، اس میں بعض اصحاب علم و کمال، مرتب کے خاندان اور خود ان کی طالب علمی اور معلمی کے دور کی مختلف موقعوں کی تصویریں دی گئی ہیں، تیسرے حصہ کا نام "نگارش" ہے، اس میں پرنسپل فضل الرحمن، مسٹر منظر الحق، ڈاکٹر راجندر پرشاد وغیرہ کے اردو اور انگریزی خطوط اور تحریروں کا عکس شائع کیا گیا ہے، یہ مجموعہ سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے حصوں کی تقسیم سے بھی خوش ذوقی ظاہر ہوتی ہے، انداز نگارش بھی دلکش ہے،

**بیان میرٹھی** مرتبہ ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل تقطیع متوسط کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۷۶ مجلد مع گرد پوش قیمت ۲۰ روپیہ پتہ، ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل محمد علی روڈ، مومن پورہ، ناگ پور۔

محمد مرتضی بیان میرٹھی انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر کے ایک صاحب کمال شخص تھے اتفاق سے اردو کے جواں سال ادیب و شاعر ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل کی نظر سے انکے چند اشعار گذرے جن سے متاثر ہو کر انھوں نے اس گمنام شاعر اہل قلم کے حالات و کلام کی جستجو کا بیڑہ اٹھایا، زیر نظر کتاب انکی اسی دلچسپی اور توجہ کا نتیجہ ہے انھوں نے بیان کے حالات کی دریافت اور کلام کی فراہمی کیلئے مختلف کتابوں اور رسالوں کی ورق گردانی بھی کی اور ان سے واقفیت رکھنے والے جن اشخاص کا پتہ چلا ان سے خط و کتابت اور ملاقات بھی کی، اس کتاب میں پہلے بیان کے خاندانی اور ذاتی حالات و کمالات کا ذکر ہے اور آخر میں انکی شاعری پر مبسوط تبصرہ کیا گیا ہے، بیان نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور اردو کی طرح فارسی میں بھی مشق سخن کی ہے، ساحل صاحب نے ہر صنف کلام میں بیان کے شاعرانہ کمالات خصوصاً اس طرح واضح کئے ہیں جن سے خود انکے اچھے شعری و ادبی ذوق کا پتہ چلتا ہے بیان گو اپنے دور کے نامور معاصرین کے ہم پایہ نہ رہے ہوں تاہم وہ قابل توجہ ضرور تھے ساحل صاحب کی اس قدردانی نے بیان کا نام ضائع ہونے سے بچا لیا۔



**سفینۂ غزل** از جناب عروج زیدی صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۱۶۰، مجلد مع گرد پوش قیمت پندرہ روپیے، پتہ نشنل اکاڈمی انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی (۲)، عرفان زیدی گھر سیف الدین خان رام پور۔

جناب عروج زیدی ایک پختہ مشق شاعر ہیں، ان کے قطعات کے مجموعہ کا ان صفحات میں پہلے ذکر آچکا ہے، یہ غزلوں کا مجموعہ ہے، عروج صاحب احسن مارہروی مرحوم کے واسطہ سے حضرت داغ دہلوی کے شاگرد ہیں، اس لیے زبان کی سلاست و سادگی، اور بیان کی صفائی و روانی انکا طرۂ امتیاز ہے، انھوں نے غزل کو صرف معاملات حسن و عشق ہی کا ترجمان نہیں بنایا ہے، بلکہ وہ زندگی کے موجودہ نشیب و فراز اور عہد حاضر کے مسائل و معاملات کا ذکر بھی کرتے ہیں، مگر چونکہ ان کو غزل کی روایت سے واقفیت ہے، اور وہ تغزل کے پوری طرح مزاج شناس ہیں اس لئے اس کا رچاؤ اور اس کی رنگینی و لطافت ہر موقع پر برقرار رہتی ہے، جدت اور تجربہ پسندی کے شوق میں اردو غزل جس ناہموری اور عدم توازن کا شکار ہو رہی ہے، عروج صاحب کی شاعری اس سے محفوظ ہے، ان کی اصل خوبی ان کا معتدل و متوازن انداز سخن ہے، زبان و بیان کی طرح ان کے فکر و خیال میں بھی بلندی اور پاکیزگی ہے، امید ہے کہ سفینۂ غزل کو ارباب ذوق میں مقبولیت حاصل ہوگی۔

**حدیث حیات** مرتبہ جناب رئیس نعمانی صاحب تقطیع خورد کاغذ بہتر کتابت و طباعت معمولی صفحات ۵۰، قیمت ۵ روپیے ۵۰ پیسے شائع کردہ عثمان ۱۹۱ اصطبل چارباغ، لکھنؤ،

جناب رئیس نعمانی نے فارسی زبان کی ترویج کے لیے طرحی تحریری مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا ہے اور ان میں حصہ لینے والوں کی حوصلہ افزائی کے لئے انعام دینے کا فیصلہ بھی

کیا ہے، جو مقابلہ میں سب سے بہتر غزل کہنے والے کو دیا جائے گا، اس کتابچہ میں ان حضرات کی غزلوں کے منتخب اشعار شائع کیے ہیں، جو مقابلہ کی شرطوں کے مطابق اور اس طرح آں راکہ "گرمیٔ ایماں حیات نیست" میں کہی گئی تھیں، اس انتخاب میں یو۔ پی، بہار، بمبئی، حیدرآباد، دہلی اور پنجاب کے اہل سخن و اصحاب ذوق کا کلام شامل ہے، چند ہندو اور خواتین شعرا بھی اس بزم سخن میں شریک ہیں، فارسی شعر و سخن کا مذاق عام کرنے کی یہ کوشش لائق تحسین ہے۔

**رنگ برنگے پھول** مرتبین جناب شہباز حسین و نند کشور صاحبان، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت
**بچوں کی نظمیں)** و طباعت عمدہ، صفحات ۹۶ مجلہ، قیمت دس روپے، پبلیکیشنز ڈویژن
پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔

بچوں کے بین الاقوامی سال کے موقع پر مختلف زبانوں میں ان کے لیے کتابیں بھی شائع کی گئی تھیں، پبلیکیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند نے اس موقع پر بچوں کے لیے رنگ برنگ اردو نظموں کا یہ مجموعہ شائع کیا ہے، اردو کے بعض اہل قلم اور شاعروں نے بچوں ہی کے لیے نظمیں اور کتابیں لکھی تھیں جیسے اسمٰعیل میرٹھی، حامد اللہ افسر میرٹھی، شفیع الدین نیر وغیرہ اس مجموعہ میں ان کے علاوہ نظیر اکبر آبادی، پنڈت دیا شنکر نسیم، حالی، چکبست، اقبال، تلوک چند محروم، جوش ملسیانی اور بہت سے موجودہ شعرا کی نظمیں اکٹھا کی گئی ہے، مجموعہ کی ابتدا حمد و مناجات کی نظموں سے ہوئی ہے، پھر ہندوستان کی عظمت پہاڑوں، دریاؤں، موسموں، قدرتی مناظر، جانوروں، پرندوں، ہندو مسلم تہواروں اور بعض نئی ایجادات پر نظمیں ہیں، بعض نظمیں اخلاقی بھی ہیں، امید ہے بچے نظموں کے اس دلچسپ اور سبق آموز مجموعہ کو شوق سے پڑھیں گے۔

"ض"

جلد ۱۲۸ ماہ ذی قعدہ ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۸۱ء عدد ۳

## مضامین



## مقالات



## تلخیص وتبصرہ



## باب التقریظ والانتقاد



---